
انور سجاد
نئی مطبوعات

چوراہا

افسانے

انور سجاد

مکتبۂ نئی مطبوعات لاہور

پبلشرز: مکتبۂ نئی مطبوعات ۷۔اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مطبوعہ انارکلی پرنٹنگ پریس گنپت روڈ لاہور نمبر ۲

بار اوّل

تعداد دو ہزار

تخیل

. . . . . . But man is in question ! So when will it be a question of man himself ? Will some in the world raise his voice ?

For man is in question, in his human presence : and the eye's enlargement over the loftiest inner [redacted] Seas !

Make haste ! make haste ! testimony for man.

WINDS
(Canto III—4)
Saint-John Purse

سونے کی تلاش

اس کی نظریں سامنے گولیوں سے چھدی ہوئی بھول بھلیاں میں بھٹک رہی تھیں۔ سارے راستے سینے پر تھے۔ باقی سارے جسم پر کوئی نشان نہ تھا۔ وہ ان بھول بھلیاں میں اپنی نگاہ تلاش کرتا ہوا آہستہ آہستہ اٹھا اور گیلری کی سیڑھیاں اترنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب، آپ کی کتابیں!" روشن نے پانی کی بالٹی فرش پر رکھی اور اس میں بوریئے کا ٹکڑا پھینک دیا۔ اس نے نگاہوں سے خالی، کھوکھلی آنکھیں روشن کے چہرے پر گاڑ دیں "کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"دیکھو میں نے تم سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ مجھے ڈاکٹر نہ کہا کرو۔ ابھی میرا ایک سال رہتا ہے۔ میرا نام مسعود ہے۔" کم بخت یہاں پریوں

پہلے سال سے ڈاکٹر کہنا شروع کرتے ہیں کہ انسان اپنا نام بھی بھول جاتا ہے ـــ مسعود نے سوچا۔

"اچھا ڈاکٹر صاحب"

مسعود مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا پوسٹ مارٹم کی میز کی طرف بڑھا پولیس سرجن اور دوسرے لوگ پوسٹ مارٹم دیکھ کر جا چکے تھے اور اس کی نگاہیں ابھی تک سینے کی بھول بھلیاں میں ٹھوکریں کھا رہی تھیں ـــ کتنا خوب صورت سینہ ہے۔ جیسے ـــ جیسے کیا؟ اُس نے کھوکھلی آنکھوں سے پھر روشن کی طرف دیکھا ـــ "ڈاکٹر صاحب مجھے اس باڈی کو کولڈ اسٹوریج میں پہونچانا ہے اور فرش بھی صاف کرنا ہے"۔

جیسے، اس کی آنکھیں خالی دیواروں کی سفیدی چاٹتی ہوئی پھر سینہ پر آگئیں اور سینہ دیواروں کی سفیدی سے سفید ہو گیا ـــ جیسے مرمر کی سل ـــ احکام کی تختی ـــ اور یہ گولیوں کے نشان، ان غاروں کے منھ جن میں داخل ہو کر جب انسان باہر آتا ہے تو مرمر کی سل بن چکا ہوتا ہے۔ جس پر وہی عبارت لکھی ہوتی ہے اور وہی غار ہوتے ہیں۔ مسعود یہ تشبیہہ سوچ کر بہت حد تک مطمئن ہو گیا کہ اب سینے کے غار روشن ہو جائیں گے اور اس کی نگاہیں لوٹ آئیں گی۔

"چلئے صاحب" روشن نے بورئیے کا ٹکڑا بالٹی میں نچوڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا بس ایک منٹ"

"اسمگلر تھا"

"ہوں"

روشن۔ بورئیے سے فرش صاف کرنے لگا۔

میں بھی لڑکوں کے ساتھ کیوں نہیں چلا گیا۔ اس نے ہولے ہولے اسمگلر کی ٹانگ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔۔۔ میں نے اتنے پوسٹ مارٹم دیکھے ہیں۔ لیکن آج تک میری آنکھوں نے نگاہیں نہیں کھولیں۔ شاید ان میں کوئی اسمگلر نہیں ہوگا۔ اگر کوئی آیا ہوگا تو اس دن ہماری کلاس نہیں ہوئی ہوگی۔ پولیس سرجن کی عادت تھی کہ پوسٹ مارٹم کرتے وقت موت کی وجہ پر اظہار خیال کیا کرتا تھا۔ "اُسے کام دیو کا نیز نہیں بلکہ چاقو لگا ہے"۔ "رقابت بڑا عجیب جذبہ ہے۔ ہاں جی لکھئے! دل کا زخم دو انچ گہرا، اور ایک انچ لمبا۔۔۔ اسے مارنے والے کے دس روپے دینے تھے۔ دونوں کے درمیان کچھ تلخی، ہوئی تو وہ اس کی جان لے گیا۔ فائدہ اسی کو رہا۔ دس روپے بھی استعمال کر لئے اور آئندہ ادھار لینے سے بھی چھٹکارا ہوا۔ لکھو جی۔ سر پر کٹے پھٹے دو زخم، بھیجا باہر نکلا ہوا اور سوڈے کی بوتل کی کرچیاں۔۔۔ یہ اسمگلر تھا، اسمگلر"۔ پولیس سرجن مسکرایا تھا۔ گولیوں کے زخموں کی تعداد اور گہرائی وغیرہ لکھوانے کے بعد

اس کے سینے اور پیٹ کی قبر کھولی تھی اور پھر روشن سے جسم سینے کے لئے کہہ کر لڑکوں کو اسمگلنگ اور ملکی معاشیات کی اہمیت سمجھا کر وہ باہر چلا گیا تھا اسمگلنگ کتنا مزیدار پیشہ ہے۔ چند منٹوں میں اتنی ڈھیر ساری رقم۔ پھر اور اسمگلنگ پھر اور پیسہ۔ انسان کتنی جلد امیر ہو جاتا ہے۔ لیکن جب اسے اسمگلنگ اور ملکی معاشیات پر سرجن کی باتیں یاد آئیں تو وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا اور اس نے کٹر نیشنلسٹ بن کر بڑی متنفر آنکھیں اس کے چہرے کی طرف اٹھائیں۔ اس کا سر لکڑی کے بلاک پر پیچھے کی طرف جھکا ہوا تھا اور اس کے لمبے لمبے سیاہ اور سفید بال نیچے لٹک رہے تھے۔ اس کی ڈاڑھی بالوں سے کچھ چھوٹی تھی، جسے روشن نے لپیٹ کر پیچھے اس کی گردن کے نیچے دبا رکھا تھا۔ اس نے گردن کے نیچے سے ڈاڑھی نکال کر اس کے زخمی سینہ پر پھیلا دی۔ یہ اسمگلر نہیں ہو سکتا۔ پھر اس نے سوچا ممکن ہے سکھ ہو۔ اس نے آنکھوں سے اُسے سر سے پیر تک ٹٹولا۔ نہیں یہ سکھ نہیں ہے تو پھر کوئی ملنگ ہو گا۔ ہاں ملنگ ہی تو ہے۔ اتنا پر سکون اور نورانی چہرہ۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے سوچا کہ اُسے یہ چہرہ پہلے کیوں نورانی محسوس نہیں ہوا۔ پھر اسے خیال آیا کہ چیزوں کی اصلیت کا پتہ ان پر غور کرنے سے چلتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ کسی چیز کو دیر تک غور سے دیکھنے پر اس کی شکل تبدیل ہونا

شروع ہو جائے۔ مثلاً بادل، اندھیرے کمرے میں کھونٹی پر لٹکے ہوئے کپڑے اور ٹوپی ـــــ اصلیت تو وہی رہتی ہے۔ لیکن انسان اپنے احساس کے جال میں پھنس جاتا ہے تو پھر اصلیت کیا ہوئی۔ احساس یا کہ چیزوں کی ظاہری صورت ـــــ یہ میرا خیال ہے کہ یہ سمگلر نہیں اور اس کا چہرہ نورانی ہے۔ چہرے کا نور اور سکون تو زندوں کی آنکھیں خواہ مخواہ مردوں کو دے دیتی ہیں۔ شاید اس لئے کہ زندگی کے چہرے کے کرب اور تاریکی سے نجات کی یہ آخری امید ہوتی ہے۔ لیکن نہیں یہ احساس تو مجھے اُسے دیکھتے ہی ہو جانا چاہیئے تھا۔ تو پھر اس کے چہرے پر واقعی سکون ہے اور یہ اسمگلر نہیں ہے تو کیا میرا غور و فکر ٹھیک ہے؟ لیکن میرا خیال مجھے دھوکا بھی تو دے سکتا ہے یہ اسمگلر ہے۔ نہیں ہے۔ ہے۔ نہیں ہے۔

"تم اسمگلر ہو؟" اس کی آخری سوچ زبان سے پھسل گئی۔

"اب بن گیا ہوں" اسمگلر نے مسکراتے ہوئے بڑی نحیف آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"یہ بعد میں سمجھاؤں گا۔ مجھے ذرا سہارا دے کر بٹھا دو۔ میں لیٹے لیٹے تھک گیا ہوں۔" وہ اپنے جسم کو دبانے لگا "زیادہ سونے سے کتنی تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔"

"ہوں،" مسعود نے دروازہ کی طرف دیکھا۔ روشن غالباً بوریا نچوڑنے

کے لئے باہر جاتے جاتے ادھ کھلے دروازے میں کھڑا تھا۔ مسعود مسکرا دیا۔ پھر اس نے کھڑکی کے شیشوں سے باہر دیکھا۔ درختوں کو تیز ہوا جھنجوڑ رہی تھی اور آسمان پر بڑے تاریک بادل چھا رہے تھے۔ "آج بارش ہو گی۔"

"نہیں ہو گی" اس نے بھی بادلوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کس طرح پتا ہے کہ نہیں ہو گی۔"

"جس طرح تم نے کہہ دیا کہ ہو گی۔"

مسعود نے سوچا کہ آدمی ذہین ہے۔ اسمگلنگ کے لئے جرأت کے ساتھ تھوڑی بہت ذہانت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ "تم واقعی اسمگلر ہو؟" میں نے کہا تھا کہ اب بن گیا ہوں۔"

"تو پہلے نہیں تھے؟"

"تھا تو ــــ لیکن جو پکڑا جائے وہی چور ہے۔"

"تم کیا اسمگل کرتے تھے؟"

"سونا"

"سونا!" مسعود نے حیرت سے کہا۔

"ہوں" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلتا ہوا شیشے کے سربند مرتبانوں میں جگر، اور گردوں وغیرہ کے حصے دیکھنے لگا۔ "میرے جسم سے کوئی خاص چیز نکلی۔؟"

"ایک بار میں تم کتنا اسمگل کر لیتے تھے؟"

"وہ اس کی آنکھوں میں سونے کی چمک دیکھ کر مسکرایا۔" میرے سینے میں کوئی گولی دولی؟"

"نہیں اس نے اپنی آنکھوں میں سونے کی چمک کو گولیوں کی بوچھاڑ سے بچاتے ہوئے کہا" کتنا سونا؟" "بہت اتنا کہ ایک ہی چکر میں قسمت بدل جائے"

"تو پھر تم بار بار کیوں گئے؟"

اور زیادہ ___ اور زیادہ ___ کرنے کی خاطر۔ مختلف چیزوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظریں میز پر جمے ہوئے خون کے لوتھڑوں پر اٹک گئیں، جو کہ دل کو صاف کرتے وقت گر گئے تھے" یہ میرا خون ہے؟"

"تمہیں صرف ایک بار ہی جانا چاہیئے تھا۔"

اس نے ہنستے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا اٹھا لیا" یہ خون نہیں سونا ہے" مسعود بھنّا گیا ___ مجھے خواہ مخواہ بناؤ نہیں۔ میں اس طرح نہیں ٹلوں گا۔ تم سونا کہاں سے لاتے تھے؟"

اس نے جواب دینے کے بجائے ہتھیلی پہ پڑا ہوا لوتھڑا کھڑکی میں مدھم ہوتی ہوئی روشنی میں جوہریوں کی طرح بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں واقعی سونے سے بڑی دلچسپی ہے۔؟"

"کسے نہیں ہوتی۔ بتاؤ نا یہ سونا کہاں سے لاتے تھے؟"

اس نے لوتھڑا زمین پر گرا دیا "سرحد کے پار سے"

"مجھے وہاں لے چلو"

اس نے بڑی تیزی سے گھوم کر نوکیلی نظروں سے اسے دیکھا، پھر نرمی سے اسے سمجھایا "تم ابھی جوان ہو اور یہ کام بہت خطرناک ہے"

"خطرات زندگی کو حسن دیتے ہیں اور پھر میں تمہاری طرح بار بار نہیں جاؤں گا۔ صرف ایک بار ـــــ چلو" مسعود نے دروازہ کی طرف جاتے ہوئے کہا "پھر سوچ لو"

"میں آج تک یہی سوچتا آیا ہوں"

"ایک دم امیر بننے کی خواہش اچھی نہیں ہوتی"

"لیکن فائدہ مند ضرور ہوتی ہے"

"ایک بار تمہیں راستہ آگیا تو تم بار بار جاؤ گے۔"

مسعود بے قرار ہو گیا "نہیں جاؤں گا بابا۔ نہیں جاؤں گا۔ اب چلو گے بھی یا نہیں۔ سونے کے بغیر میرے بہت سے کام رکے پڑے ہیں مجھے اس لمحے کا بہت دیر سے انتظار تھا"

"اسی عمر میں!"

"خواہشات کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ میں نے جب سے دوسروں کو سونا پہنے دیکھا ہے، استعمال کرتے دیکھا ہے اور اس کی اہمیت کو

سمجھا ہے۔ تب سے اُسے پانے کے لئے بے قرار ہوں۔ لیکن کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اب میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا ——— چلو۔"

اس کے ساتھی نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا "اب تو رات ہو گئی ہے اور گھٹا بھی پوری طرح چھا گئی ہے۔ پھر سہی۔"

رات اور گھٹا تمہاری موجودگی میں پھر کبھی اکٹھے نہیں ہوں گے یہ بہترین موقع ہے۔ ورنہ میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔" وہ اتنی زور سے ہنسا کہ مسعود کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔ "تم ہنستے کیوں ہو؟"

اُس نے اپنی گردن کو اپنے ہاتھوں سے دبایا "یونہی۔ تم بہت ضدی ہو۔ سونا حاصل کرنے کی خواہش بظاہر تو عام ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس سے بڑھ کر عجیب خواہش اور کوئی نہیں۔" اس نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی اپنی چادر اٹھالی اور جسم پر لپیٹتے ہوئے کہا "تم جیسا متلاشی اور جرأت مند میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ چلو میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا جہاں سے تقسیم کار سونا لاتے ہیں۔"

اُس تصور میں مسعود کے جسم پر عجیب سی کپکپی چھا گئی اور اس نے مستحسن نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچا کہ یقیناً یہ کوئی بہت بڑا اسمگلر ہو گا۔

وہ دونوں دبے پاؤں دروازے کی طرف گئے۔ روشن ابھی تک دروازے میں کھڑا تھا۔ ایک قدم اندر، دوسرا باہر اور ہاتھ میں بوریا۔ مسعود نے

رک کر اپنے ساتھی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور وہ بغیر کسی آہٹ کے دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے۔

درختوں میں ہوا کا شور تھا۔ چند ایک ٹوٹے ہوئے پتے اُن کے قریب سے گزر گئے۔ رات بہت تاریک تھی۔ آسمان پر رات کی سیاہی میں رنگی ہوئی گھٹائیں ہر روشنی تاریک ہو گئی تھی۔ سوائے اندھیرے کے اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ مسعود ان راستوں پر چار سال سے چل رہا تھا، اور اب اس تاریکی میں صرف اس کے حافظے کی روشنی تھی۔ مسعود نے مڑ کر کہا "کچھ نظر نہیں آرہا۔ میرا خیال ہے شاید سارے شہر میں روشنی نہیں، میرا ہاتھ پکڑ لو ــــــ"

"میں اسی تاریکی کے راستے آیا تھا۔ مجھے راستہ یاد ہے۔"

مسعود نے پھر بھی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ معمول سے زیادہ سرد تھا۔ مسعود نے سوچا۔ سردی خاصی ہے اور اس کے جسم میں شاید حرارت بھی کم ہو ــــــ اور وہ دونوں اناٹومی ہال والا موڑ مڑ گئے۔

"یہ اناٹومی ہال ہے۔ یہاں مردوں کی چیر پھاڑ ہوتی ہے۔" مسعود نے اُسے بتایا۔

"جسموں کی؟"

"اور کاہے کی؟" مسعود نے سوچا کیسا بچوں جیسا سوال ہے۔ وہ ہنسا۔

"تم نے کبھی مُردوں کی باتیں سنی ہیں؟"

مسعود "۔۔۔ سے کبھی سنی ہیں؟ جب سر میں سفید بال آجاتے ہیں تو انسان پھر سے بچہ بننا شروع ہوجاتا ہے۔ وہی سادگی، اور معصومیت، پاکیزگی Fantasy اور ضد" تم بچے ہو" بالکل بچے۔"

مسعود نے کہا اور وہ بالکل بچوں کی طرح ہنسا" اور تم بچے نہیں ہو جو کہ سونے کی چمک دیکھ کر متجسس ہو گئے ہو ۔۔ میں تو چاند لوں گا"

میں سونے کی اہمیت جانتا ہوں مسٹر ۔۔ میں اس کی چمک کے علاوہ اس کے وجود کو بھی اپنانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ قیمت صرف وجود کی پڑے گی۔ چمک کی نہیں"۔

"خوب" اس کی آواز میں مسکراہٹ تھی "تم کافی ذہین ہو" اور مسعود نے سوچا" میں ایک اچھا اسمگلر بن سکتا ہوں"۔

انا ٹومی ہال کی نکڑ پہ دیوار سے ٹیک لگائے۔ چوکیدار بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ مسعود نے اپنے ساتھی کا ہاتھ دبایا اور بوٹ کے پنجے پر چلنے لگا۔ مگر بوٹوں کی آہٹ نہ گئی۔ ابھی "پکار آئے گی" "ہو ۔۔۔۔ کون ہے؟" چوکیدار نے حقہ پیتے ہوئے سر گھما کر دیکھا اور تیز ہوا میں خشک پتے کھڑکھڑاتے ہوئے دیوار سے ٹکرائے۔ وہ ہوا کے ساتھ ہی اس کے قریب سے گزر گئے۔ چوکیدار پھر سے حقہ پینے لگا اور مسعود مطمئن ہو گیا کہ سوال جواب میں

وقت ضائع ہونے سے بچا یا تم بہت آہستہ آہستہ چلتے ہو۔ جلدی چلو نا"

"تم بے صبر ہو۔ اور میں بوڑھا ہوں" اس کے ساتھی نے مسکرا کر کہا۔

ٹک شاپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے مسعود رک گیا اور اس کا ساتھی بھی۔ اتنی تاریکی میں صرف ٹک شاپ کے ایک کونے میں ہلکی سی روشنی تھی۔ اس کے ساتھی نے چلنے کے لئے قدم بڑھایا۔ مسعود نے کہا

"ایک منٹ ـــ آؤ دیکھیں کون ہے"

"کوئی فائدہ نہیں"

"اندر روشنی ہے۔ اس وقت!"

"سونا اس سے زیادہ روشن ہے"

مسعود نے سنی ان سنی کر دی اور وہ دونوں دیوار کی اوٹ میں کھڑکی کی جالی سے جھانکنے لگے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی بیٹھے تھے۔ درمیان میں موم بتی جل رہی تھی۔ مسعود کی گرفت اس کے ہاتھ پر سخت ہو گئی۔ "مجھے پہلے ہی شک تھا" مسعود نے سرگوشی کی "میں کل رپورٹ کروں گا کہ ٹک شاپ کا ناجائز استعمال ہوتا ہے"

"دراصل تم چاہتے ہو کہ اس لڑکے کی جگہ تم ہوتے ـــ"

مسعود نے حیرانی سے اسے دیکھا "تمہیں کیسے پتہ چلا"

"تجربہ ـــ" (موم بتی نے یہ روشنی لڑکی کے گلے میں پڑے ہوئے

سونے کے لاکٹ سے لی ہے اور لاکٹ میں اس لڑکے کی تصویر ہے۔ اور میں یہ تصویر پھاڑ دوں گا۔"

"موم بتی کو دوبارہ روشن کئے بغیر نہیں اور تم روشنی کی تلاش میں نکلے ہو۔"

مسعود کو فوراً یاد آیا کہ وہ اس وقت یہاں تک کس سفر میں پہنچا ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر چلو" اس کے ساتھی نے اسے کھڑکی سے کھینچتے ہوئے کہا اور مسعود تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دور تک پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔

شہر میں روشنی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ تیز ہوائیں روشنی اکثر بجھ جاتی ہے اور پھر آسمان پر تاریک بادل بھی تو ہیں۔ مسعود نے سوچا کہ اگر وہ ہوسٹل سے ٹارچ اور یہ ساتھی مانگ کر لے آتا تو بہتر ہوتا۔ لیکن ٹھک شاپ میں موم بتی جل رہی تھی اور وہ اسے جلد سے جلد بجھانا چاہتا تھا۔ کل جب میں اس موم بتی کو چھوڑوں گا تو یہ سونے کی بن جائے گی — اس نے سوچا — پھر تو بڑے اطمینان سے اس کے گلے میں اس موم بتی کا لاکٹ پہناؤں گا۔ میں نے آج تک اس سے بات نہیں کی ہے میں نے ہمیشہ اسی طرح جالی سے جھانکا ہے۔ اس کو اسی طرح چھوڑ دی گیا ہے۔ اور اس کی بھاگتی ہوئی کار سے اڑتی ہوئی دھول جاتی

ہے۔ لیکن کل ۔۔۔۔ کل سے میری کار کے پیچھے اڑتے ہوئے غبار میں
سونا ہو گا۔ اور ۔۔۔۔ اور سرحد تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا۔ مسعود
نے اس سے پوچھا۔

"جتنا چلو گے، اتنا کم وقت لگے گا۔"

"تم مجھے ایک ہی بار اتنا سونا دے دینا کہ مجھے بار بار نہ آنا پڑے۔"

"جتنا اٹھا سکو گے لے لینا۔"

اس کے ساتھی کی رفتار کچھ تیز ہو گئی تھی۔ مسعود تھوڑے ہی دور چلتے چلتے
پھر ایک دو قدم پیچھے رہ جاتا تھا۔ اس نے سوچا کوئی سواری ہی لے لیتے
تو بہتر ہوتا۔ لیکن اس وقت کہاں ۔۔ اور اگر ہو بھی تو کرایہ کون ادا کرے
گا۔ کل سہی ۔۔۔ کل سے میں پیدل نہیں پھروں گا۔ کل سے میں پڑھائی
چھوڑ کے بزنس شروع کروں گا۔ ڈاکٹری میں کیا رکھا ہے۔ پہلے اتنا
پیسہ اور وقت صرف کرو اور بعد میں کوئی مستقبل نہیں۔ اسے اپنے
کتنے دوست یاد آئے جو ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد ڈسپنسری نہیں
کھول سکے تھے اور جنہیں نوکری بھی بڑی مشکل کے بعد ملی تھی اور جنہیں
نوکری نہیں ملی تھی اور جو شہر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ٹکے
کباب یا مٹھائی کی دکان کھولنے کے بارے میں غور کر رہے تھے۔
وہ کون ڈاکٹر ہیں جو اتنا بہت کما رہے ہوں گے؟ اس کے ذہن میں کئی نام

آتے ۔ لیکن ان سب کو مواقع ملے تھے ۔ دراصل ہر پیشے میں انسان کو اگر کچھ کرنے کا موقع ملے تو ہی وہ کچھ کر سکتا ہے ـــــ لیکن ڈاکٹری باقی تمام پیشوں سے محفوظ پیشہ تو ضرور ہے ، پر آمدنی رفتہ رفتہ ہی بڑھتی ہے ، اور میں فوراً امیر ہو جانا چاہتا ہوں ۔ اب کتنا اچھا موقع ملا ہے ـــــ سونے کی تجارت ـــــ اس قسم کی تجارت ۔ اس قسم کی تجارت کو کم ظرف ہی اسمگلنگ کا نام دیتے ہیں ۔ لیکن میرے ملک کی معاشیات ؟ ـــــ لیکن میں ؟ ـــــ اس کے ڈھیلے پڑتے ہوئے قدم پھر تیز پڑ گئے ـــــ میں زیادہ ضروری ہوں ۔ جب تک میں خود اتنے بھاری بوجھ تلے سے باہر نہیں آؤں گا ، اور کسی کے لئے کیا کر سکتا ہوں ۔ میرا سینہ اس رقم تلے پس رہا ہے ، جو کہ میرا ماموں میری پڑھائی پر صرف کر رہا ہے ۔ میرے ماموں کو مجھ میں صرف اس لئے دلچسپی ہے کہ میں اس کا بھانجا ہوں ، جس کا مستقبل بنا کر اس کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کر دے گا ۔ اور اس طرح ان کے احسانات کا بدلہ کچھ دے سکے گا جو اس کی ماں نے اپنے والدین کی وفات پر اپنے بھائی کو پال پوس کر کئے تھے ۔ مسعود کو اپنے ماموں کی لڑکی سے کوئی دلچسپی نہ تھی ، بلکہ اسے اس طوق کی گرفت بڑی شدت سے محسوس ہوتی تھی ۔ اُسے ڈاکٹر بنانے کا فیصلہ بھی اس کے ماموں نے ہی کیا تھا ، اور یہی سمجھ کر اسے پڑھا رہے تھے کہ یہ پیسہ ان

بیٹی پر ہی لگ رہا ہے۔ لڑکی بھی گھر ہی میں رہے گی۔ اور خاوند بھی اچھا مل جائے گا۔ اور اب جب سے اس کالج میں داخل ہوا تھا۔ اس کے ذہن کے کسی نہ کسی کونے میں وہ لڑکی چیونٹی کی طرح رینگتی رہتی تھی جو کہ کار پر آئی تھی، جس کے گلے میں سونے کا لاکٹ تھا، اور جس سے اس نے آج تک بات نہیں کی تھی۔ ہر روز ماموں کے پیسوں کی چار دیواری اونچی ہوتی جاتی تھی اور اس کے گلے پر ماموں کی لڑکی کی انگلیوں کا دباؤ بڑھتا جاتا تھا۔ کل یہ چار دیواری گر جائے گی اور یہ انگلیاں کٹ جائیں گی۔ مسعود نے مسکراتے ہوئے اپنے گلے پر ہاتھ پھیرا

"سلو! ہم کب تک وہاں پہنچیں گے۔"

اس نے جواب کے لئے اس کی طرف دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا

مسعود نے یک لخت گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ چاروں طرف کھیت ہی کھیت تھے، کٹی ہوئی فصلوں کے چھوٹے چھوٹے منتشر کھڑے تھے۔ چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں دور مکانوں کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ یہ میں کہاں آ گیا ہوں؟ —— آسمان پر تو بادل تھے۔ رات بہت تاریک تھی۔ اور شہر میں روشنی نہیں تھی۔ یہ کون سی جگہ ہے اور میں یہاں کس وقت پہنچا ہوں۔ اس نے پھر سے اسی سمت دیکھا۔ جدھر وہ دونوں جا رہے تھے۔ بہت دور ایک سایہ جا رہا تھا —— "ٹھہرو"

اس نے چیخ کر کہا۔

اس کے ساتھی نے دہیں سے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہیں بہت جلدی تھی۔"

مسعود نے اپنے آپ سے اپنی شرمندگی چھپانے کے لئے اسے آہستہ سے بڑے غصے میں گالی دی۔ اس کا ساتھی رکا نہیں تھا۔ مسعود گھبرا کر اس کی طرف بھاگنے لگا۔ اس کا ساتھی اسی مسلسل رفتار سے چل رہا تھا۔ سخت زمین پر کٹی ہوئی فصل کے نوکیلے خشک ڈنٹھلوں سے اس کے گھسے پھٹے بوٹ اور بھی چھد گئے تھے۔ تھوڑی دور بھاگنے کے بعد اس کے بوٹ کا تلا بالکل جواب دے گیا —— اس نے رک رک کر جلدی جلدی بوٹ اتارے اور پھر بھاگنے لگا —— خشک زمین میں اگے ہوئے کانٹوں کی نوکوں پر —— اندھا دھند —— اس کے ذہن میں صرف وہ سایہ تھا، جس تک اسے پہنچنا تھا۔ ورنہ وہ اجنبی کھیتوں میں بھٹک بھٹک کر مر جائے گا۔ کیونکہ وہ اپنی جیب میں وہ دانے لے کر نہیں آیا تھا۔ جنہیں وہ راستہ بھر بکھیرتا آتا تاکہ واپسی پر اگی ہوئی فصل دیکھ کر راستہ ڈھونڈنے میں دقت نہ ہوتی۔

"تم مجھے پیچھے کیوں چھوڑ آئے ہو۔" مسعود نے اس کے پاس پہنچ کر ہانپتے ہوئے پوچھا۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اس کا

ساتھی خاموش تھا۔ اور سانس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ بولا"

"میں نے تمہیں نہیں چھوڑا۔ تم خود ہی پیچھے رہ گئے تھے۔"

"مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا، تم کب آگے نکلے ہو۔"

مختلف قسم کے خیالات رفتار کو مدھم کر دیتے ہیں۔ اگر تمہارے ذہن میں صرف اپنی منزل کا خیال ہوتا تو تم کبھی پیچھے نہ رہتے"

"میں اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا"

"اگر تم صرف وہاں تک پہنچنے کے بارے میں سوچ رہے ہوتے تو تمہاری رفتار بھی مجھ اتنی ہوتی۔"

مسعود کچھ حیران ہوا کہ اسے کیسے پتہ چلا کہ وہ کچھ اور بھی سوچتا رہا ہے پھر اس نے سوچا کہ اس نے یہ نتیجہ منطقی طور پر اخذ کیا ہے اور وہ ایک قدم پیچھے رہ گیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے ٹھہرنے کے لئے کہا۔ وہ بغیر رکے بولا "چلے آؤ، چلے آؤ۔ منزل ہی بہت جلدی تھی۔ اس راستہ پر سستایا نہیں جاتا۔ ممکن ہے کوئی آملے۔"

اس بیابان میں کون آئے گا۔ رک جاؤ۔ میرے پیروں میں شدید درد ہو رہا ہے" اس کی آواز میں التجا تھی

اس کا ساتھی ہنسا۔ "تم میں خواہش ہے، جرأت ہے۔ لیکن قوت برداشت نہیں ہے۔ اگر مجھے پتہ ہوتا تو میں تمہارے ساتھ کبھی نہ

آتا پہلے تم مصائب جھیلنے سیکھتے، پھر اس راستے پر آتا۔ جانتے ہو۔ جب کوئی اسمگلنگ کرتے ہوئے پکڑا جاتا ہے تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے ــــ اس کو بڑی بڑی اذیتیں دی جاتی ہیں تا کہ اس سے اور اطلاعات مل سکیں۔ اگر وہ سختی نہ جھیل سکے اور سب کچھ بک دے تو پھر اور اسمگلنگ کے سارے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ تم تو اس راستے سے ہی گھبرا گئے ہو۔ اگر پکڑے جاؤ تو ؟"

"میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ مگر خدا کے لئے اس وقت ایک پل رک جاؤ۔ مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ مسعود وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور اس کے ساتھی کو رکنا پڑا۔ پیر دباتے ہوئے پیروں سے بہتا ہوا خون محسوس ہوا۔ میرے پیروں سے خون بہہ رہا ہے۔"

"اسے دل سے بہنا چاہیے تھا۔ پھر یہ سونا ہوتا ــــ سونا ـ"

"بعض وقت تم بڑی عجیب سی باتیں کرتے ہو۔"

"جب تم میری طرح سونا پا لو گے تو تم بھی ایسی باتیں کرنے لگو گے بے معنی سی۔" وہ ہنسا "اب چلو۔ کافی سستا لیا ہے۔ اگر صبح ہو گئی تو کبھی سرحد نہ پار سکیں گے ــــ پھر تم ــــ"

"کتنی دور ہے سرحد ــــ؟" مسعود نے تھکی ہوئی آواز میں پوچھا

"وہ جو سامنے سفید سی لکیر ہے ــــ افق سے ذرا نیچے ــــ وہ"

"کیا ہے وہ ؟"

"دریا ہے" — چاند کی روشنی میں دریا چمک رہا تھا —

مسعود گھٹنے سے دوسرا پیر زمین پر اُتار کے اُٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کچھ کہے ہوئے لنگڑاتا ہوا چلنے لگا۔ اس کا ساتھی بھی خاموشی سے چلنے لگا۔ مسعود اپنے پیروں سے بے پرواہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا — اسی رفتار سے مسلسل — اگر صبح ہو گئی تو کیا ہو گا۔ — پھر میں کبھی سو نہیں پا سکوں گا — پھر یہ شخص مجھے کبھی نہیں ملے گا۔ اور میں ماموں کے پاس اپنی گروی زندگی کو کبھی نہیں چھڑا سکوں گا۔ مجھے صبح ہونے سے پہلے ہی سرحد پار کر لینی چاہیئے۔ ورنہ میرا دم ایسی زندگی کی قید میں گھٹ گھٹ کر ختم ہو جائے گا۔ مجھے سرحد پار کر لینی چاہیئے۔ ابھی تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی اور دریا ابھی دور ہے اور ٹک شاپ میں موم بتی بھی تو ابھی جل رہی ہو گی۔ مجھے اس موم بتی کو تو بجھانا ہے۔ اس موم بتی کے سوتے سے اس لڑکی کو لاکٹ بھی تو پہنانا ہے — جاگو جلدی کرو — مسعود بھاگو بھاگو — اُس نے مڑ کر ساتھی کو دیکھا کہ اس سے جلدی چلنے کے لئے کہے — مگر اس کا ساتھی پھر غائب تھا۔

"کہاں چلے جاتے ہو تم"؟ اُس نے روہانسا ہو کر چیخ کے کہا

بھاگو، جلدی کرو مسعود، اسے دفع کرو — سامنے دریا ہے۔ اور اب صبح

ہونے ہی والی ہے۔ اگر رکو گے تو مجھے ایک ایک کر کے ہیرجان پھسلتے ہی جائیں گے۔ اگر دریا پار کر لیا تو اس کے بعد وہاں تمہیں کوئی نہ کوئی مل ہی جائیگا۔ دنیا میں صرف ایک دریا ہی تو ــــ بھاگو مسعود ــــ ساری دنیا تمہارے ہاتھ کی ایک لمس کی منتظر ہے۔ ذرّہ ذرّہ سونا بننے کے لئے بے قرار ہے۔ تمہیں اس لڑکی کے گلے میں سونے کا لاکٹ پہنانا ہے ــــ جلدی کرو جلدی ــــ ورنہ یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب کی طرح تمہارے ذہن پر نقش ہو جائے گا ــــ لیکن اس کے بغیر میں دریا تک کیسے پہونچوں گا مجھے تو آگے کچھ نظر نہیں آرہا۔ صرف وہ پانی کی لکیر ہے۔ اس تک کون سا راستہ جاتا ہے۔ ہر راستہ مجھے دریا کے متوازی نظر آرہا ہے ــــ وہ پاگلوں کی طرح گھومنے لگا۔ اس کی کنپٹیاں بے طرح بجنے لگیں۔ اس کا رواں رواں کانپنے لگا۔ سارے مساموں سے پسینہ ابلنے لگا۔ اس کے لہولہان پیروں میں درد پھر سے لوٹ آیا تھا۔ پیر سوجنے کے باعث اس کے قدم اتنے بوجھل ہو گئے تھے کہ اس سے اٹھائے نہیں جاتے تھے۔ وہ لمحہ بھر کے لئے رکا۔

کہاں ہو تم؟ ــــ اس کی چیخ سے فضا گونج اٹھی۔ دور سے ہلکے سے قہقہے کی آواز آئی۔ اس نے غور سے قہقہے کی سمت دیکھا ــــ اس کا ساتھی تھا۔ گھبراہٹ میں ہر وہ چیز نظر نہیں آتی جس کی تلاش ہوتی ہے۔ مسعود نے

اطمینان کا سانس لیتے ہوئے سوچا، یہ مجھ سے آگے کیوں نکل جاتا ہے۔ تم سوچتے ہو اور سوچنے سے رفتار کم ہوتی ہے۔ ذہن میں صرف منزل کا دھیان ہونا چاہیئے۔ اگر تم اسی طرح اور کچھ سوچتے رہے تو تم وہاں تک کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔ پھر صبح ہو جائے گی ـــــ اور ـــــ وہ پھر اٹھ کر اپنے ساتھی کے سائے کی طرف بھاگنے لگا۔ اس کے پیر سُن ہو گئے تھے۔ اس کے پیر ٹخنوں کے ساتھ نہیں رہے تھے۔ زمین کو پیروں سے چھونے کا احساس بھی پیروں سے بہتے ہوئے خون کے ساتھ بہہ گیا تھا۔ جوں جوں وہ سائے کی طرف بڑھتا جاتا تھا۔ سایہ اس سے دور ہوتا جاتا تھا۔ میرے ذہن میں صرف میرے مقصد کا دھیان ہونا چاہیئے۔ اگر میں نے کچھ اور سوچا۔۔۔ بھاگو مسعود نہیں صبح سے پہلے وہاں پہنچنا ہے ـــ وہ سامنے دریا ہے، وہ سامنے سایہ ہے ـــ وہ سامنے سوتا ہے۔ اس کا ساتھی دریا کے کنارے بیٹھا اس کا منتظر تھا۔ مسعود نے بڑے غصّے سے اس سے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ مگر اس نے اپنے منہ پر انگلی رکھ کر اسے منع کر دیا۔ مسعود کی نظریں ـــــــ اس کی نظروں کو کھینچ کر اپنے پیروں پر لے آئیں۔ پیر سوج کر اصل سے دو گنے ہو گئے تھے اور ان پر خون کی تہہ جمی تھی۔ اس کے ساتھی نے مسکرا کر اس کے کندھے تھپکاتے ہوئے سرگوشی کی۔ " شاباش کوئی بات نہیں۔ راستوں پر یوں ہو جایا کرتا ہے۔ اب تو ہم پہنچ گئے ہیں۔ "

مسعود نے تھکی سے بیان حاصل کر کے دریا کے کنارے کو بڑے غور سے دیکھا "کشتی وغیرہ تو ہے نہیں ہم اسے کس طرح پار کریں گے۔"

"دیکھتے رہو" — اس کے ساتھی نے اپنی چادر کو دوبارہ لپیٹتے ہوئے کہا ———

"عصا لگاؤ گے ؟"

"یہ نیل نہیں ہے"

"تو پھر"

"غور سے سنو۔ میں پہلے دریا میں قدم رکھوں گا۔ تم میرے پیچھے پیچھے آتے جانا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ دریا کہاں سے گہرا ہے اور کہاں سے نہیں۔ اور ہاں دریا میں پیر رکھنے کے لیے تم سوچنا بالکل بند کر دو گے۔ ورنہ تمہارا پیر کہیں ادھر ادھر پڑ گیا تو ڈوب جاؤ گے۔"

"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ ذہن کبھی سوچ سے خالی بھی رہ سکتا ہے۔"

دریا پار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سوچ ختم ہو جائے۔ پھر اس نے سوچ کر کہا۔ "اچھا یوں کرو میرا ہاتھ پکڑ لو۔"

مسعود نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ پہلے سے زیادہ سرد تھا۔ بالکل برف۔ مسعود نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ اور اس نے جواب میں کہا — "کیا سردی کم ہے ؟"

اس کے ہاتھ کی برف مسعود کے ہاتھوں کی رگوں میں اترنے لگی۔ اس کا ساتھی دریا میں پیر رکھ چکا تھا۔ "آؤ" مسعود نے بھی پیر دریا میں ڈال دیا۔ اس کی رگوں میں اُترتی ہوئی برف اس کے دماغ تک پہنچ گئی۔ اس کا دماغ بالکل سُن ہوگیا اور وہ اتنا ہلکا ہوگیا جیسے اس کا کوئی بوجھ ہی نہیں تھا اس کے قدم دھند میں پڑ رہے تھے۔ وہ بادلوں میں بادل بن گیا۔ وہ ہواؤں میں ہوا ہوگیا۔ اس کا ذہن، ذہن نہیں رہا تھا۔ ورنہ ضرور کچھ سوچتا، وہ کچھ نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی وہ تھا ـــــ مگر کیا تھا۔ اندھیروں میں اندھیرا، روشنیوں میں روشنی یا خلاؤں میں خلا، یا خلاؤں میں وجود یا میں کون ہوں ؟ ـــــ میں کیا ہوں؟ مجھے کیا ہوگیا ہے ؟ ـــــ اس نے اپنے ساتھی کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے پوچھا اور اس کا پیر دریا میں کسی گڑھے میں پڑتا پڑتا بچا۔ اس کے ساتھی نے اسے کھینچ لیا اور وہ دوسرے کنارے پر تھے۔

"ابھی گرنے لگے تھے۔ دیکھ لیا پھر سوچ کا نتیجہ! شکر کرو میں کنارے پر تھا۔ ورنہ اسمگلنگ وغیرہ سب رہ جاتی۔"

مسعود نے مڑ کر دیکھا۔ دریا اسی طرح بہہ رہا تھا۔ اسے جھرجھری آگئی۔ اس نے سامنے دیکھا۔ افق پہ کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر ساتھی سے کہا "سورج نکل رہا ہے۔" "اب ؟"

اس کے ساتھی نے روشنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "نہیں۔ یہ

سورج نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا ہے۔"؟

"روشنی ہے۔"

"یہ کاہے کی۔؟"

"تم سونا لینے آئے ہو، اپنے کام سے غرض رکھو۔ اس کے ساتھی نے پہلی مرتبہ اُسے ڈانٹا۔ مسعود نے اس سلسلہ میں کچھ کہنا چاہا لیکن پھر چپ ہو گیا کہ کہیں یہ ناراض ہو گیا تو کیا ہوگا۔ "اب ہمیں کتنی دور جانا ہے؟"

"نزدیک ہی ہے۔ آؤ۔"

وہ دونوں لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے گزرنے لگے۔ مسعود بار بار مڑ کے اس روشنی کو دیکھتا جاتا تھا جو سورج کی نہیں تھی۔ "یہ کس چیز کی روشنی ہے" مسعود نے بار بار اپنے دل میں سوال کیا۔ ایسی روشنی میں نے آج تک نہیں دیکھی، چاند، سورج، آگ، بجلی۔ ان سب کی روشنیوں کا مجموعہ ــــ پھر بھی ان سے الگ تھلگ۔ یہ روشنی کہاں پر ہے؟ اس روشنی کا منبع کیا ہے؟ اس کے ساتھی نے اس کا کندھا ہلایا۔ اس نے روشنی سے نظریں ہٹا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ ایک کمرے میں کھڑا تھا۔

"اٹھا لو ــــ جتنا سونا اٹھا سکتے ہو۔"

"سونا کہاں ہے ؟"

"تمہارے سامنے سونا ہی سونا ہے۔ لاتعداد سونے کی اینٹیں پڑی ہیں۔"

"مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ـــــ میری آنکھوں میں وہ روشنی نہ ہے۔"

مسعود نے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"تھوڑی دیر آنکھیں بند کر لو"

"میں آنکھ نہیں جھپک سکتا۔"

"یہ تو سانپ کی خاصیت ہے۔"

"میں سانپ نہیں ہوں ـــــ مجھے اتنا بتا دو یہ روشنی کس چیز کی ہے"؟

اس نے پھر دروازے سے باہر روشنی کو دیکھا ـــــ یہ روشنی سب روشنیوں کا مجموعہ ہے۔ پھر بھی ان سے الگ تھلگ ـــــ اس کے ساتھی نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا ـــــ اب مسعود کے سامنے سونے کی اینٹیں ہی اینٹیں تھیں ـــــ "اب تو تمہیں سونا نظر آ رہا ہے سونا ـــــ"

"اب جب کہ میں یہاں آ گیا ہوں۔ مجھے یہ روشنی بھی دیکھنے دو۔"

"تم سونا اٹھاؤ اور چلو۔"

"یہاں نہیں جاؤں گا۔ مجھے رہ رہ کر اس روشنی کا خیال آتا رہے گا۔ دیکھو یہاں تک پہنچتے پہنچتے لہولہان ہو گیا ہوں۔ مجھے اتنا ہی بتا دو یہ

روشنی کس چیز کی ہے، مسعود نے بہت التجا بھرے لہجے میں کہا۔

اس کے ساتھی نے کچھ وقفہ کے بعد کہا۔" یہ تم خود پہچانو۔"

" سونا ـــ ؟ اتنا عجیب و غریب "

" ہاں سونا ہی کہہ لو "

" کس قسم کا سونا ہے، جس کی ایسی روشنی ہے۔ "

" جس نے بھی آج تک یہ سونا دیکھا ہے، اُسنے بیان نہیں کر سکا۔"

" کیوں ـــــ ؟

" کیونکہ اسے کسی چیز سے بھی تشبیہ نہیں دی جا سکتی، مختلف لوگوں نے اس کی مختلف شکلیں بنائی ہیں۔ لیکن اصل ـــ"

" تو وہ تھوڑا سا یہ سونا ہی لے آتے۔ اس کا ایک تولہ اس سونے کے ایک ٹن کے برابر ہوگا ـــ اتنا عجیب کہ کوئی بیان بھی نہ کر سکے۔

" ہوں ـــ لیکن اسے لانے کے لیے بڑی کڑی شرطیں ہیں ـــ تم چھوڑو اسے ـــ جتنی اینٹیں اٹھا سکتے ہو۔ اٹھا لو۔ "

" مجھے وہاں لے چلو ـــــ ورنہ میں واپس نہیں جاؤں گا۔

مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ تم ضرور ضد کروگے۔ اس راستے سے جو بھی آتا ہے، اسی سونے کی خواہش کرتا ہے۔ انہیں دوسرے راستے سے لاتا تو بہتر ہوتا۔"

پھر اس نے مسعود کو سمجھایا۔ "دیکھو تمہیں جو کچھ چاہیئے یہیں سے
لے جاؤ۔"

مسعود نے سوچا ــــ ایک بار میں یہ سونا اتنا نہیں لے جایا جا سکتا مجھے ایک بار اور آنا پڑیگا۔ اس سونے کا ایک تولہ ہی کافی ہے۔ اگر یہ شرطیں کڑی ہیں تو کیا ہوا۔ کوئی چیز ایسی نہیں جسے انسان نہ کر سکے۔ جن کا ذکر یہ کر رہا ہے۔ آخر وہ لوگ بھی تو وہاں تک پہنچے ہی ہوں گے۔ میں یہاں تک آگیا ہوں تو وہاں تک کیوں نہیں جا سکتا ــــ اس کے ساتھی نے دونوں ہاتھوں میں سونے کی اینٹیں اٹھا کر اس کی طرف بڑھائیں۔ "یہ لو!" "یہ تو مٹی ہے ــــ اسے جب تک وہاں سے خود نہیں اٹھاؤں گا یہ سونا نہیں بنے گی ــــ لیکن میں اسے چھوڑوں گا بھی نہیں ــــ مجھے وہاں لے جاؤ۔" اس نے بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پھر التجا کی۔
"میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔" "بڑے ضدی ہو" اس نے اینٹیں واپس انبار پر پھینک دیں ــــ "یہ ضد نہیں، خواہش ہے ــــ لگن ہے۔"

اس نے سامنے والی دوسری دیوار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اب تم نے اس لگن کی خاطر اپنے آپ کو انسان زخمی کیا ہی ہے تو پھر تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کوئی ملا تھا ــــ لیکن تم اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچو گے کہ تمہیں اس سونے تک پہنچنا ہے ــــ ورنہ میں پھر آگے نکل جاؤں گا۔ اور اب

تم میں اتنی سکت نہیں ہو گی کہ بھاگ کر مجھ تک آسکو۔

"تم فکر نہ کرو" مسعود نے بے صبری سے کہا۔

"اور ہاں ——— راستے میں بڑی بڑی مصیبتیں آئیں گی ——— لیکن نہیں، اب مجھے تمہاری قوت برداشت پر اعتماد ہو گیا ہے۔ آؤ" اس کے ساتھی نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور وہ اس کے سامنے تھوڑی دور ہٹ کر مرمر کی پہاڑی تھی۔ پہاڑی کی شکل مرمر کی بہت بڑی سل ایسی تھی۔ اس کے ساتھی نے پہاڑی کے ایک حصہ کے ساتھ پڑی ہوئی مرمر کی سل اٹھائی۔ سامنے ایک بہت بڑے غار کا منہ تھا۔ جانے مسعود نے کیا سوچ کر اس سے پوچھا۔ "اس سل کی شکل سینے ایسی کیوں ہے ؟

دیکھا میں نہ کہتا تھا۔ اب تم نے مجھ سے ایسے سوال شروع کر دیئے ہیں۔ غار کے اندر جانے سے پہلے ایک وعدہ کرو کہ تم اب مجھ سے کوئی سوال نہیں کرو گے۔ ورنہ میں تمہارا ساتھ چھوڑ دوں گا۔"

"اچھا" ——— اور مسعود کے ذہن میں فوراً ایک اور سوال اُبھرا۔ کہ اس سینے پر بندوق کی گولی سے بنا غار کا منہ کیوں ہے؟ اس نے اس سوال کو دماغ ہی میں دبا دیا۔ غار کے اندر اس کے پیچھے داخل ہوتے ہی اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اور وہ تاریکی میں گرتا ہی چلا گیا۔ کافی دیر کے بعد جب اس کے پیر زمین پر لگے تو اندھیرا غار روشن ہو گیا اور اس نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑے صحرا میں پایا۔ صحرا کی روشنی عین سامنے سے آرہی

تھی اور اس سونے کی روشنی سے ملتی جلتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب تیزی ذرا زیادہ تھی ـــــ اب ہم عنقریب اس تک پہنچ جائیں گے۔ مسعود نے سوچا ـــــ اس کا ساتھی اس روشنی کی سمت میں اس کے آگے چل رہا تھا۔ وہ صحرا میں کتنا ہی عرصہ چلتے رہے۔ اس کے پہلے ہی سے زخمی پیروں میں پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے آبلے مل کر اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ پیر بھی ایک بہت بڑا آبلہ بن گئے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اس کے پیچھے چلتا جا رہا تھا۔ اس نے ساتھی کو رکنے کے لئے ایک دو آوازیں بھی دیں تھیں۔ لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہ تھا۔ پیاس سے اس کے حلق میں پڑنے ہوئے کانٹوں میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا، دور دور تک پانی کا نشان نہیں تھا۔ اس نے ایک آبلے پر چلتے چلتے دوسرے کو نوچ کر آبلے کا پانی پینا چاہا۔ لیکن پانی ہاتھ میں بہہ کر ریت میں جذب ہو گیا۔ اسے ریت میں چمکیلے ذرّے نظر آئے ـــــ سونا! ـــــ اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے روشنی کی طرف دیکھا۔ منزل دور نہیں تھی ـــــ یہ سونا ان شعاعوں سے گرا ہوگا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس کو پھر پیاس نے تنگ کیا۔ تو اس نے دوسرے پیر کو بھی نوچا۔ پانی پھر ریت میں جذب ہو گیا اور سونا! اس نے نظریں اٹھائیں۔ روشنی کے عین نیچے چمکتا ہوا پانی نظر آ رہا تھا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بڑی تیزی سے پانی کی طرف بھاگنے لگا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس کے پیر پھوٹ بہے ہیں۔ وہ بڑی تیزی سے اپنے ساتھی کے قریب سے گزر گیا۔ جوں جوں وہ پانی کی طرف بڑھتا جاتا تھا۔ پانی کی لکیر سمٹ کر اکٹھی

ہوتی جاتی تھی۔ جب وہ وہاں تک پہنچا تو وہاں پانی تھا نہ پانی کا نشان۔ بلکہ وہ چمکیلی پہاڑیوں میں گھرا اکھڑا تھا۔ ان پہاڑیوں میں ان گنت غار تھے اور ہر غار کے منہ سے اسی سونے کی روشنی پھوٹ رہی تھی اور تیز اور چمکیلی ۔۔۔

وہ ایک غار کے سامنے بیٹھ کر سستانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا ساتھی بھی پہنچ گیا۔ "تم نے بہت جلدی کی۔"

"مجھے پیاس لگی ہے"

"پیاس کو مارو"

"مجھے بھوک لگی ہے"

"اسے بھی مارو" ۔۔۔ اٹھو! ۔۔۔ ہمیں سونے تک پہنچنا ہے۔"

مسعود نے بڑی مشکل سے اٹھتے ہوئے نگاہوں سے پوچھا "کس غار میں ۔۔۔؟"

"سبھی سونے تک جاتی ہیں۔" کسی ایک میں چلو۔

وہ دونوں سامنے والے غار میں داخل ہو گئے۔ اندر بے حد روشنی تھی۔ مسعود کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ جب اس نے پوری توجہ سے غور کیا تو اس نے دیکھا کہ یہ روشنی بڑے بڑے پتوں سے آ رہی ہے۔ صرف گیارہ پتوں سے۔ باقی سارے سبز تھے۔ یہ روشنی کچھ اس قسم کی تھی جو اس نے دریا پار کرنے سے لے کر یہاں تک دیکھی تھی ۔۔۔ لیکن اب یہ بہت تیز تھی ۔۔۔ بہت ہی تیز ۔۔۔ یہ سارے پتے سونے کے کیوں نہیں ہیں ۔۔۔ صرف گیارہ پتوں سے روشنی کیوں آ رہی ہے ۔۔۔ اور درخت کا تنا بھی عام درختوں ایسا ہے ۔۔۔ سوچتے

ہونے جب اس کی آنکھیں اس روشنی سے کچھ کچھ مانوس ہو گئیں تو اس نے محسوس کیا کہ اس درخت کے نیچے کوئی بیٹھا ہے اور اس کا جسم بالکل ڈھانچہ سا ہے ———

"یہ کون ہے؟"

"تم نے پھر سوال کیا۔"

"صرف اس کا جواب دے دو۔ اگر کوئی اور سوال کیا تو بے شک میرا ساتھ چھوڑ دینا۔"

"اب تمہارا ساتھ تو میں کیا ہی چھوڑوں گا ——— یہ بھی اسمگلر ہے" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اسمگلر؟ ——" مسعود کو یقین نہ آیا۔

"جیسے ہیں اور تم"

"ہاں، میں ہوں، اور تم تم تو۔ —— مگر یہ کون ہے؟"

"یہ ہم دونوں ہیں"

"ہم دونوں کا نام کیا ہے؟"

"اسمگلر"

مسعود نے اس پنجر پر غور کیا، تو درخت کے نیچے وہ خود آمنے سامنے بیٹھا تھا۔ "چلو" اس کے ساتھی نے کہا۔

"میرے پیر بوجھل ہیں۔ مجھ سے اٹھا نہیں جاتا۔"

تمہیں اٹھنا پڑے گا۔

"میرے جسم میں جان نہیں ہے۔ مجھ سے ہلا بھی نہیں جاتا۔"

"تمہیں چلنا پڑے گا"

"لیکن ہم سونے تک کب پہنچیں گے، مجھے سونا چاہیئے، سونا کہاں ہے۔؟"

"بس ۔۔۔ ذرا آگے"

"مسعود گھٹنوں کے بل چلنے لگا۔" یہ اور اسی قسم کے دوسرے غاروں میں سب لوگ سونا لینے آئے تھے۔ لیکن ۔۔۔" مسعود کی زبان دانتوں تلے آگئی۔ اس کے کان بند ہو گئے۔ اور اس کی آنکھوں میں بہت بڑی قندیل تھی۔ اور اس قندیل میں وہ سونا تھا اور اس سونے سے لاتعداد رنگوں کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ ہر شعاع کے ان گنت رنگ تھے اور پھر ان لاتعداد رنگوں کے ان گنت رنگ۔ ان رنگوں کا ایک، ایک قطرہ چاند، سورج، آگ اور بجلی کے حلق میں ٹپک رہا تھا ۔۔۔ کوئی نو ستر ہزار سال کے بعد یہاں تک پہنچتا ہے اور کوئی اتنی جلد ۔۔۔ مسعود نے سوچا ۔۔۔ اور ہاتھ بڑھا کر بڑی بے صبری سے سونے کی طرف بڑھا۔۔ اس کے ساتھی نے اسے کندھے سے تھام لیا۔

کیوں؟ ۔۔۔ مسعود نے مڑ کر اس سے پوچھا۔

میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کو اسمگل کرنے کے لیئے بڑی شرطیں ہیں

"کیا ہیں؟ ۔۔۔ میں انہیں پورا کر دوں گا"

"تمہیں اپنی زبان اور دونوں ہاتھ کٹوانے پڑیں گے۔"

"لیکن برڈ کے پنجے سونے کے ہیں، اور اس کے نیچے ——"

"وہ سونا نہیں چمک ہے —— وہ اور دوسرے غاروں کے سب ہی باسی اس شرط کو سُن کر صرف چمک لے کر لوٹ گئے تھے۔ اور یہ سونا ہے"

"لیکن یہ شرط کیوں ہے" ——؟

"زبان کا کام ہے بولنا اور ہاتھوں کا کام ہے لینا دینا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ سونا کسی کو نہیں دوں گا اور کسی کو اس بارے میں بتاؤں گا بھی نہیں۔"

"تو پھر اس کو لے جانے کا فائدہ ہی کیا ہے —— میں تم کو اسی لئے یہاں لانا نہیں چاہتا تھا کہ تم سونا تو نہیں لے جا سکتے اور اس کی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے پیش نہیں کر سکتے۔ زبان تو بولے گی ہی۔"

مسعود کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کوئی اتنی مصیبتیں جھیل کر یہاں پہنچنے کے بعد کس طرح خالی ہاتھ لوٹ سکتا ہے۔ "تو پھر ——؟"

"تم ذرا آرام کر لو پھر چلیں گے۔"

"اگر میں سونا لے کر بھاگ جاؤں تو ——؟" مسعود نے بیٹھتے ہوئے کہا ——

اس کا ساتھی ہنسا "تو سرحد پر مارے جاؤ گے۔" —— اس نے سینہ سے چادر ہٹائی۔ اس پر گولیوں کے نشان تھے —— مسعود نے سوچا اسمگلنگ میں ہر طرح کے خطرات پیش آتے ہیں۔ اور اگر اس کو گولیاں لگ گئی ہیں تو ضروری نہیں کہ میں بھی نشانہ بنوں۔ اس نے دوسرے کو عرصہ ہو گیا ہو گا؟

اور پھر خطرے کے بغیر زندگی کا مزہ ہی کیا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" ــــ "کچھ نہیں!" ــ "سستا لو۔ تمہاری جان پہلے ہی آدھی رہ گئی ہے۔"

مسعود وہیں لیٹ گیا اور آنکھیں موند کے سونا اڑا لے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے خراٹوں کی آواز آئی۔ اس نے اٹھ کر دیکھا اور اس کا ساتھی بے خبر سو رہا تھا۔ اب موقع ہے اٹھو۔ قندیل سے جتنا سونا نکال سکتے ہو نکال کر بھاگ جاؤ ــــ لیکن راستہ؟ ــــ اس سونے کی روشنی میں ڈھونڈنا نہیں پڑے گا ــــ اس نے اپنا سانس بھی روک لیا۔ اور اپنے ساتھی پر نظریں جما کر اٹھ کھڑا ہوا ــــ قندیل کا دروازہ کھولتے ہی اس کے ارد گرد بڑی گہری دھند چھا گئی، جس میں شعاعیں معلق ہو گئیں۔ اس کے لرزتے ہاتھوں میں جلتی ڈلیاں آئیں۔ لے کر بھاگنے لگا۔ تب بڑے زور زور سے ہلنے لگی اور چاروں طرف آوازوں کا شور اٹھا ــــ

پکڑو ــــ دوڑو ــــ جانے نہ پائے ــــ چور ــــ چور ــــ

اس نے مٹھیوں میں سونا اور بھی دبا لیا ــــ اور اندھا دھند بھاگنے لگا۔ ــــ بھاگو ــــ دوڑو ــــ چور ــــ چور ــــ وہ بھاگتا ہی جا رہا تھا ــــ وہ خوفناک آوازیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں ــــ اس نے سونے کی روشنی میں راستہ پلک جھپکنے میں طے کر لیا ــــ سامنے دریا تھا ــــ دو قدم کے فاصلے پر ــــ آوازیں اور بھی قریب ہو گئی تھیں۔ اس کے بالکل ساتھ ــــ آنکھیں بند کر کے دریا میں چھلانگ لگاتے ہی

جانے کہاں سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی ۔ ـــــ اور اُس کا سینہ چھلنی چھلنی ہوگیا وہ خوفناک آوازیں بھیانک قہقہوں میں ڈھل گئیں ـــــ اس کے ہاتھوں سے سونا گر گیا اور وہ خالی ہاتھوں سے سینے کو سہلاتا ہوا دریا کی تہہ میں اترتا ہی چلا گیا ـــــ سسکتا ہوا ۔

اس کی سسکیاں سن کر روشن دروازے سے باہر جاتے جاتے لوٹ آیا ـــــ " کیا ہوا ڈاکٹر صاحب ! ـــ ابھی تو آپ ٹھیک تھے ؛

" کچھ نہیں ـــــ کچھ نہیں روشن " ـــــــ

اس کے ہاتھ اپنے سینے کے بجائے ، سامنے پڑی ہوئی لاش کے سینے کو سہلا رہے تھے ۔

آنکھ اور سایہ

کوٹھڑی $\frac{8' \times 10'}{12'}$

آہنی دروازہ ۵' × ۳'

آہنی دروازے کے بالکل سامنے کھڑکی ۲' × ۳'

کھڑکی کی سلاخیں قطر ۲"

سلاخوں سے باہر تاریکی آزاد۔ سلاخوں کے اندر تاریکی قید ——

ابھی تھوڑی دیر میں جب پرندے آسمان پر اندھیرے کا تعاقب کریں گے تو کچھ لوگ آئیں گے اور اسے اس کمرے کی تاریکی سے آزاد کر دیں گے۔ وہ لکڑی کے تختے سے اتر کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے کان اور آنکھیں آہنی دروازے پر لگی تھیں۔ لیکن تالے میں ابھی زبان نہیں پڑی تھی۔ دروازے کے درمیان گول سوراخ میں کوئی آنکھ نہیں تھی۔ یہ

لوگ آتے کیوں نہیں ہیں ؟ میں گزشتہ دو مہینوں سے ان کا منتظر ہوں، وہ اُٹھ کر بستر کے قریب آ کے کھڑا ہو گیا اور بستر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ بستر برف کی سِل تھا۔ بغیر سلوٹ کے اور سرد، پائینتی کی طرف کمبل پڑا تھا، تو آج رات میں بالکل نہیں سویا۔ مجھے نیند تو آ رہی تھی۔ لیکن میں شاید سونا بھول گیا تھا۔ بستر پر کمبل بھی پڑا ہے، سردیاں ہوں گی۔ مجھے تو ٹھنڈ بالکل نہیں لگ رہی، شاید اس بار سردی جلد ختم ہو گئی ہو ورنہ داروغے کو کمبل اٹھوانا یاد نہیں رہا ہو گا۔ وہ مسکرایا۔ لیکن اس کے ہونٹ فوراً ہی سکڑ گئے" کیسے ممکن ہے کہ مجھے یہاں سے نکالنا بھی اسے یاد نہ رہے۔ ؟ اس نے دروازے کی طرف ـــــ جب وہ آئیں گے تو میں مسکرانے لگوں گا اور بڑے سکون سے ان کے ساتھ جاؤں گا۔ کیونکہ آج تک جتنے بھی لوگ میری طرح اس کمرے میں آ کر نکلے ہیں، ہمیشہ بڑے سکون سے مسکراتے ہوئے نکلے ہیں۔ اس نے آنکھیں موند کر انگڑائی لی۔ میں اتنا تھکا ہوا کیوں ہوں ؟ ـــــ اس نے بستر کی طرف پھر دیکھا۔ اور میں ساری رات کمرے میں گھومتا رہا ہوں۔ اور مجھے سونا یاد نہیں رہا ہو گا ... اس نے جماہی لی ـــــ اس کا بدن ٹوٹنے لگا ـــــ اور وہ بستر پر بیٹھ گیا، آ جاؤ کمبختو، میں بہت تھک گیا ہوں ـــــ وہ لیٹ گیا ـــــ

"میرے لعل" اس کی ماں کے پوپلے منہ سے آواز آئی تھی۔ اور وہ اپنے برقعے کا نقاب اٹھا کے اسے بس دیکھنے لگی تھی۔

"بائیں کرو ماں ـــــ مجھے اس طرح نہ دیکھو۔"

بلکہ فوراً مجھے اپنی گود میں چھپا لو۔ آج پھر میں مسجد سے بھاگ گیا تھا۔

اور ابا نے مجھے مسجد کی دیوار کے ساتھ اخروٹ کھیلتے دیکھ کر بہت پیٹا ہے اور وہ پھر مجھے پیٹنے آرہا ہے، وہ کہتا ہے، آج وہ مجھے بالکل مار دے گا۔

”بڑا آیا مارنے والا۔“

”اس حرامی نے آج پھر سپارے کو ہاتھ نہیں لگایا۔“

”میرا ایک ہی بچہ ہے: اسے بھی مار کے دم لو گے؟“

”نکما، حرام زادہ“

”مجھے اپنی گود میں چھپا لو ماں —— تم چپ کیوں ہو؟ دیکھو میں خود ہی نہا دھو کے آیا ہوں اور تمہیں میرے پیچھے بھاگنا نہیں پڑا۔ میں نے نئے کپڑے پہنے ہیں اور بال بنائے ہیں۔ میری بلائیں لو تاکہ مجھے نظر نہ لگ جائے۔

”بلائیں کروں نا ماں۔ ہمارے کرایہ دار کا لڑکا ہسپتال میں تھا۔ اب اس کا کیا حال ہے؟“

”میرے ہیرے۔“

”ماں اس کے سینے کے ساتھ لگ کر رونے لگی تھی وہ بھی پھوٹ پھوٹ کے رویا تھا۔ لیکن اس کے آنسو نہیں بہتے تھے اور آواز بھی حلق سے نیچے رہی تھی۔

”میں رو تو نہیں پُتّر بس یونہی دل بھر آیا تھا۔“

”اس میں رونے کی بات ہی کیا ہے۔ سنا ہے ایسے موقعوں پر تو لوگ خوش ہوا کرتے ہیں۔ اور میں بہت خوش ہوں۔ بہت ہی خوش۔ اس نے چاروں اور دیکھا تھا۔

"میں تمہارے لیئے مٹھائی لائی ہوں۔ ماں نے برقعے سے لفافہ نکالا۔ "تمہیں برفی پسند تھی نا"

اس نے لفافہ کھولا اور اُسے متلی ہونے لگی، سر چکرانے لگا، پیٹ میں بل پڑنے لگے۔ میرا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہتا۔ برفی بھی نہیں، مجھے بھوک نہیں لگتی ـــــ "تم کتنی اچھی ہو ماں۔"

"لاؤ میں تمہیں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں۔"

اس کی ماں نے لفافے سے برفی کا ٹکڑا نکال کے اس کے منہ میں ڈالا ماں مجھے قے آرہی ہے۔ نہ نہ ماں۔ بس بس۔ وہ اپنی ماں کی اس حرکت پر ہنسنا بھی چاہتا تھا۔ اب مجھ پر گوٹے والا دوپٹہ ڈال کر وتاتا صاحب سلام کرانے بھی لے جاؤ گی۔؟ ـــ بس کرو۔ اب میں قے کر دوں گا۔ اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھ لیئے تھے۔

ماں نے خالی لفافہ پرے پھینک کر اسے سینے سے بھینچ لیا تھا۔ اتنی زور سے نہیں ماں۔ اس طرح تم مجھے اپنے سینے کے اندر تھوڑا ہی چھپا لو گی۔ ماں اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتی چپکے چپکے رو ئے جا رہی تھی اور اسے نیند آنے لگی تھی۔

میری پگلی ماں ـــ وہ مسکرایا۔ بازار میں بچے کھیلتے کھیلتے بڑے ہو گئے ہیں۔ میرے تینوں دوستوں نے اپنا اپنا کاروبار سنبھال لیا ہے۔ دودھ دہی کی دوکان۔ رہٹرا اور جوئے کی بیٹھک۔ سب اپنے فارغ اوقات میں بھنگ پیتے ہیں، جوا کھیلتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور شادی

شدہ ہونے کے باوجود تانگا سننے کے بعد اکثر ان ہی کے کوٹھوں پر سوتے ہیں
میرے چوبیس گھنٹے فارغ ہیں۔ کبھی کبھی ان میں اکتائی ہوئی گھڑیاں، دوست
کا ڈیرا، دریا کا کنارہ اور دوڑ۔ اکتائی گھڑیاں، سموں کے نیچے، پھر وہی
چوبیس کے چوبیس گھنٹے فارغ —— تو کوئی بھی کام کر۔ اس کا باپ گرجا۔ ابا
مجھے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم نے کھانڈ کی ٹیک سے جو مکان بنوایا ہے اس کا آدھا
حصہ اور نیچے کی دو دکانوں کا کرایہ ہمارے لئے بہت ہے —— ماں میں تانگے
گھوڑے سے بھی اکتا گیا ہوں — بیٹے ابھی گنتی کے چار دن ہی تو ہوئے
ہیں —— لو ماں پیسے —— میں تانگہ گھوڑا بیچ آیا ہوں —— نکھٹے منہ
اوے ملعونی حرامزادے —— وہ باپ کے غصے پر ہنسنے لگا —— اس کی ہنسی
ہونٹوں پر سمٹتے سمٹتے اداس ہو گئی تھی۔ وہ سر نیوڑھائے بیٹھا تھا۔ سامنے
کٹہرے والی چارپائی کے اوپر سیاہ چادر تھی۔ اور اس کی ماں رو رو کر ہلکان
ہو رہی تھی۔ اب تو خرچ پھر بھی کم ہو گیا ہے —— اب ہم دو رہ گئے ہیں۔
بیٹا میں بہو لاؤں گی۔ نہیں ماں ابھی تو میرے کھانے پینے کے
دن ہیں —— ویسے ان لوفروں کے ساتھ نہ بیٹھا کر —— تو پھر میں کیا
کروں ویسے یہ حرامی تمہیں خراب کر دیں گے۔ ماں یہ مجھے کیا خراب
کریں گے —— یہ تم چارپائی پر لیٹے لیٹے کیا سوچتے رہتے ہو —— یہ صرف
کچھ نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ تمہارا دماغ الٹی باتوں میں مصروف رہتا ہے۔
ورنہ۔ نکھٹو۔ —— اگر میں اتنا ہی بیکار ہوں تو پھر مجھے اس چارپائی پر لیٹے
لیٹے —— ماں میں بیکار کہاں ہوں، میں تو بھنگ پیتے ہوئے ہوں۔ دراصل یہ

کچھ بکواس ہے ۔ زندگی بکواس ہے ۔ دنیا میں جو چیز بیکار ہے اسے زندگی
کہنا چاہیئے ۔ مثلاً رس بھری بوٹی کو بھوگ نہیں بلکہ زندگی کہنا چاہیئے ۔ ماں
میں بھوگ ہوں ؟ میرا رس کہاں گیا ؟ ـــــ میں زندہ ہوں ۔ میری بوٹی کہاں
ہے ؟ میں بھنگی ہوں ؛ ساری دنیا بھنگی ہے ۔ کیوں کہ سب زندہ ہیں ، تو
پھر مر جانا چاہیئے ۔ ـــــ ادھ مرا ہوں ۔ ـــــ خود ہی بھوگ کی طرح سوکھ
کر ہوا میں بکھر جاؤں گا ـــــ سب بکھر جائیں گے ۔ چھت کی کڑیاں کتنی
ہیں ـ یہ کمرہ ڈول رہا ہے ۔ تو بھی ڈول رہی ہے ماں ـــ تو بھی بھنگی
ہے ـــ ہا ـــ ہا ـــ ہا ـــ ہا ـــ ہا ـــ وہ قہقہا ہی ہنا ـــ وہ آنکھیں
بند کر کے ماں کے سینے کے ساتھ لگ گیا تھا ۔

کسی نے اس کا کندھا ہلایا ۔ داروغے نے کہا ـــ "کتنے مزے سے سو رہا ہے ؟"

اس نے آنکھ کھولی ـــ سرمئی اندھیرے میں سائے تھے ـــ

"جانے ان لوگوں کو نیند کس طرح آجاتی ہے" مجسٹریٹ نے کہا ۔

"نیک مقصد کے لئے جان قربان کر دینے میں سکون تو بہت ہے ۔ خاکروب نے جیسے اپنے آپ سے کہا ـــ

"اٹھو بھئی" داروغے نے اس کا کندھا پھر ہلایا ۔

اس نے آنکھیں کھولیں ـــ چاروں اس پر جھکے ہوئے تھے ـــ وہ
یکایک ڈر گیا ۔ کون ہو تم لوگ ؟ ـــ اس نے کہنیوں کے سہارے خود کو
بستر کے پیچھے گھسیٹا ۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا ۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ

کر بھاگ جائے۔ باہر دروازے کے وسطی گول سوراخ میں آنکھ تھی۔ لیکن میں کیوں بھاگوں۔ ؟ اگر بھاگنا ہی تھا تو اتنا سفر طے کر کے یہاں کیوں آیا تھا —— اور اگر کوشش بھی کروں تو —— دروازہ بند ہو گیا تھا اور باہر سوراخ میں لال آنکھ تھی۔

"خوب نیند آئی ؟ —— ڈاکٹر نے ٹوٹیاں جیب سے نکال کے گردن کے سامنے اٹکا دیں اور نبض پر انگلیاں رکھ دیں

جی ہاں —— خوب مزے سے سویا" —— اس نے جمائی لی اور مسکرایا

ان چاروں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ "اس قسم کے قاتل اس طرح کیوں ہوتے ہیں۔" —— داروغہ بڑبڑایا۔

"ڈاکٹر صاحب —— میں بیمار نہیں ہوں۔"

ڈاکٹر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کیا کہے —"نہیں، نہیں" —— اس نے اس کے سینے سے سویٹر اور قمیص ہٹا کر ٹوٹیوں سے دل کی آواز سنی۔ "ٹھیک ہی ہے۔" —— ڈاکٹر نے ٹوٹیاں جیب میں ڈال لیں۔

"چلو" —— داروغے نے کہا۔

اس نے اٹھتے ہوئے اچانک سوال کیا: "اگر بیمار ہوتا تو ؟"

تو تمہارے صحت مند ہونے تک انتظار کرتے۔ مجسٹریٹ نے کہا۔

"ہوں!" —— اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی —— میں بیمار ہوں —— بہت ہی بیمار —— مجھ سے اٹھا نہیں جاتا —— میں بالکل مریض ہو گیا ہوں —— آپ لوگ دیکھتے نہیں —— تم میری نبض پھر دیکھو ڈاکٹر...

"اٹھو جلدی کرو" ــــ داروغے نے اپنی جیبی گھڑی نکال کر دیکھی۔
"وقت ہو رہا ہے"

"ہوں" اس نے داروغے کے ہاتھ کی طرف دیکھا جس میں گھڑی تھی۔
اس نے باری باری سب کو دیکھا، اور اس کی نظریں پھر داروغے کے ہاتھ میں گھڑی کے ساتھ ساتھ ہلنے لگیں ــــ ٹک ٹک ٹک ٹک۔ اس کے سینے کے اندر بھی یہی آواز ٹک ٹک کی آواز گھڑی سے نکل کر اس کی طرف بڑھنے لگی اور دل گھڑی کی طرف ــــ اٹھو ــــ گھڑی کی نیم پگھلی موم زمین پر رفتہ رفتہ اترنے لگی، سینے کی آواز گھڑی کے باہر اور گھڑی کی آواز سینے کے باہر ــــ

ٹک ــ ٹک ٹک ٹک ٹک ــــ آواز کہاں ہے؟ سوئیاں کہاں ہیں؟ حرف کہاں ہیں؟ وقت ہو رہا ہے، کتنے بجے ہیں؟ ہنہ وقت ہو رہا ہے۔ اس گھڑی میں تو آواز ہی نہیں، وقت ہی نہیں۔ اور ــــ ڈاکٹر ــــ میں بیمار ہوں ــــ میرا دل دھڑک رہا ہے، دیکھو دیکھو، ڈیٹوں سے دیکھو" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے بیٹھے بیٹھے سینہ بڑھایا۔

سب ہنس پڑے ــــ "جانے ان لوگوں کو تختے پر بھی کیوں ہنسی سوجھتی ہے" ٹھاکر صاحب نے اپنے آپ سے کہا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ واقعی گھڑی تو ــــ اس نے داروغے کو جیب میں گھڑی ڈالتے ہوئے دیکھا ــــ میں آپ کی گھڑی دیکھ

سکتا ہوں ــــــ ؟

داروغے نے گھڑی نکال کر اس کے سامنے کر دی ۔ وہ مسکرایا ـــــ

چلیے ۔ "ــــــ

دروازے کی دہلیز میں وہ رک گیا ۔ اس نے پلٹ کر کمرے کا جائزہ لیا ۔ میں اب اِس کمرے میں کبھی نہیں آؤں گا ــــــ وہ خوش تھا ۔ مگر پھر بھی اس نے آنکھیں بند کر کے سر جھکا لیا اور وہاں کی ہوا کو پوری طرح پھیپھڑوں میں بھر کے نکل آیا ۔

اس نے کوٹھری سے باہر آ کے پُرزور انگڑائی لی اور سرمئی اندھیرے میں ان چاروں کو دیکھا ۔ ان کی شکلیں بہت دھندلی سی تھیں ۔ اس کی نظریں آسمان کی طرف اُٹھ گئیں ۔ ستارے نیلاہٹ مائل سیاہی میں گھُل کر پھیل رہے تھے ۔ اس نے باری باری پھر ان کو دیکھا ۔ ان کے چہرے بھی پانی میں سیاہ رنگ کے چھینٹے تھے جو رفتہ رفتہ پیندے کی طرف اُترتے پھیل رہے تھے ۔ اس نے فوراً اپنی آنکھیں ملیں ۔ اس کی انگلیاں آنکھوں میں دور تک اترتی چلی گئیں ۔ اس نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا ۔ آسمان کے سمندر میں طوفان آ رہا تھا ۔ بڑی بڑی لہریں اٹھ رہی تھیں اور ان لہروں پر دو آنکھیں ابھر ابھر کر ڈوب رہی تھیں ۔ یہ آنکھیں کس کی ہیں ؟ دیکھو دیکھو داروغہ جی یہ آنکھیں کس کی ہیں ـ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ۔ آپ لوگ کہاں ہیں ۔ ؟ " ــــــ

" ہم تمہارے سامنے ہیں "

"اب اور کتنی دور جانا ہے۔"

"وہ سامنے دیوار سے ذرا ہٹ کر ـــــ وہ چوکھٹا"

دیوار کہاں ہے؟ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔ میں تو ان کے ساتھ دروازے سے باہر نکلا تھا۔ لیکن میرا قدم کہاں پڑا ہے؟ میں اونچی اونچی دیواروں میں کیسے گھر گیا ہوں؟ اور دیواروں میں غاروں کے منہ کھلے ہیں یا شاید کمروں کے دروازے ہیں، اور سیڑھیاں ہی سیڑھیاں دیواروں سے اترتی ہوئی یا آسمان پر چڑھتی ہوئی۔ ٹوٹی پھوٹی۔ نئی نئی، جو ان کمروں میں جارہی ہیں یا ان کمروں سے آرہی ہیں۔ اور یہ تنگ راستہ جس کے ہر قدم پر موڑ ہے اور جس پر بہتی دھند کی تہہ میں پیر کھو گئے ہیں۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں؟ ـــــ سامنے صرف ایک آئینہ ہے ـ سانس کی ہوا اٹھ سے دھندلا یا ہوا، چاروں اور دھواں ہی دھواں اور دھوئیں میں ابھرتی سیڑھیاں، دیواریں اور دیواروں میں پھٹے غاروں کے منہ۔ یہ سب کچھ میں دیکھ رہا ہوں؟ ـــــ نہیں۔ میری بھنوؤں کے نیچے دو سوراخ ہیں۔ اور دو آنکھیں وہاں سمندر میں ہچکولے کھا رہی ہیں۔ نیچے دھند کی تہہ میں میرے پیر ہیں اور اوپر پانی میں پھیلتے ہوئے سیاہ دھبے ہیں لیکن سنا ہے تب آسمان پر کوئی طوفان نہیں آیا تھا۔ پانی میں دھبے نہیں تھے۔ اس کی آنکھوں پر پٹی تھی اور اس کا بیٹا صاف و شفاف کپڑے پہنے اس کی چھری کے نیچے لیٹا تھا۔ جب چھری چلانے کے بعد اس نے آنکھوں سے پٹی کھولی تھی تو دنبہ ذبح پڑا تھا۔ اور اس کا بیٹا پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اور مسکراتا ہوا کھڑا ہوں۔

نہیں میں تو چل رہا ہوں، اور دھند کے پہیوں پر پھسل رہا ہوں، اور یہ مجھے کسی
سامنے کی دیوار سے ذرا ہٹ کر چوکھٹے تک پہنچنا ہے — میں نہایا تھا
اور صاف کپڑے پہنے تھے اور میری ماں نے کہا تھا کہ حوصلہ کرو تم قربان
ہو رہے ہو۔ تب بھی مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور میری ماں رو رہی تھی۔
دیکھو میرا کتنا حوصلہ ہے کہ میں اتنی خوش ہوں اور میری سمجھ میں ابھی تک
نہیں آیا کہ اس کی آنکھوں میں خوشی پانی بن گئی تھی یا غم — میں چل رہا
ہوں یا کھڑا ہوں اور میرے پاؤں دھند میں گھل کر بہہ رہے ہیں، چوکھٹے
کی طرف۔ لیکن۔ چوکھٹا ہے کہاں؟ — یہ بھول بھلیاں ہیں، ہر قدم
موڑ ہے اور ہر موڑ پر چوکھٹے کا خیال کہ اب سامنے ہوگا، اور وہاں
میری گردن پہلے ہی موجود ہوگی۔ میری ماں بھی کتنی بے وقوف ہے، اور
میں اس سے بھی زیادہ۔ کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں اگر واقعی یہ قطعی ناممکن
ہے، میری آنکھیں میری ہی باندھی ہوتی پٹی کے پیچھے سے نکل کر آسمان
کی لہروں پر آ گئی ہیں اور میں خود چھری کے نیچے لیٹا ہوا ہوں۔ چھری کے نیچے
گردن کس کی ہے؟ آسمان کے بھنور سے آنکھوں نے پہچاننے کی کوشش
کی اور اس غبارے کے منہ سے لال دھواں کیوں نکل رہا ہے۔ اتنا سرخ دھواں —
میں اس کمرے کی سیڑھیوں پر کیوں اتر رہا ہوں؟ اس دھند میں میرا دم
گھٹ رہا ہے، مجھ سے جلتے مُردے کی یہ بو برداشت نہیں ہوتی۔ یہاں
سے قرر قرر کی آوازیں کیوں آ رہی ہیں۔ ایسی آواز تو بکرے کی شہ رگ کٹنے
پر آتی ہے — قرر قرر — یہ کون تڑپ رہا ہے — آنکھوں کی ادھڑ

سے غور سے دیکھا —— پر تو —— یہ تو میں بیٹھا ہوں اور —— اور —— میرے ہاتھ میں چھری ہے۔

سامنے سرخ تالاب میں لاش نہا رہی تھی اور زمین پر سمٹی ہوئی خون کی سرخ انگلیاں اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ کٹی ہوئی گردن سے خرخراہٹ کی آواز آئی اور وہ گھبرا گیا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ تو میں نے دکان کے اندر داخل ہوتے ہی بند کر دیا تھا تو یہ آواز ؟ —— سامنے پڑے ہوئے جسم نے جھرجھری لی۔ گردن سے پھر آواز آئی اور اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی چھری کو دیکھا، چھری کی نوک پر خون کی بوند گرتے گرتے اٹک گئی تھی۔ میں نے اس کو واقعی قتل کر دیا ہے ؟ —— یہ دروازہ بند کر کے دن بھر کی کمائی گن رہا تھا۔ میں نے اندر آ کے پہلے دروازے کی کنڈی لگائی تھی اور ردی خریدنے کے بہانے اسے کتابوں کی الماری کے پیچھے لے گیا تھا اور پھر —— اس کے ہاتھوں میں چھری کانپنے لگی اور چھوٹ کر خون میں جا گری —— خون کی انگلیاں اس کی طرف بڑھتی بڑھتی جم گئیں۔ اس نے اپنے کانپتے ہاتھوں کو دیکھا —— نہیں —— نہیں —— یہ میرے ہاتھ نہیں ہو سکتے —— میں اسے قتل کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ چھری اس جن نے چلائی ہو گی —— اس کا قاتل جن ہے —— تم لوگ مجھے اس لاش کے پاس تنہا کیوں چھوڑ گئے ہو —— تم کہاں ہو —— ماں میں تنہا ہوں اور بیچارہ —— اس کے ارد گرد سرخ دھواں اٹھنے لگا —— یہ تو لائن میں نے

نہیں کیا۔ بھوت کی پرچھائیں، جن کا سایہ مجھ کو میاں لاکر چھوڑ گیا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ماں، ابلتے ہوئے دھوئیں میں جھریوں والا ہاتھ ابھرا۔ یہ لو میرے بیٹے اسے گلے میں ڈال لو —— وہ تعویذ کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھا اور ہاتھ پیچھے ہٹنے لگا —— لاؤ نا ماں وہ آگے بڑھا، ہاتھ اور پیچھے۔ وہ اور آگے، تعویذ ہاتھ سے پھسلتا پھسلتا چھوٹ کر گر پڑا۔ اور جھریوں والا ہاتھ آہستہ آہستہ مضبوط مردانہ ہاتھ میں ڈھل گیا۔ یہ ہاتھ کس کا ہے؟ —— میرے ہاتھوں جیسا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ایک ہاتھ نہیں تھا۔ سامنے دھوئیں میں دوسرے ہاتھ سے خون کی بجائے ٹھنڈی ہو کر بہہ رہی تھی۔ یہ تو میرا ہاتھ ہے۔ اس نے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی اور ہاتھ بھاگنے لگا۔ وہ ہاتھ کے پیچھے۔ یہ ہاتھ مجھے کھینچ کے کہاں لے جا رہا ہے؟ یکدم سرخ دھواں چھٹ گیا اور وہ ہاتھ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اندھیرے میں شام کی نیلاہٹ ابھری اور وہ سہم کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے دیکھا کہ سامنے آسمان پر جلتے ہوئے کوئلے کی آگ دور زمین پر گر رہی ہے۔ اس کا وجود آہستہ آہستہ پگھل رہا ہے۔ ناحدِّ نگاہ زمین سے چھریاں اُگ رہی ہیں۔ جلتے ہوئے کوئلے کی آگ اتنی تیز ہو گئی ہے کہ چھریاں بھی دہکنے لگی ہیں۔ اس کا وجود پگھل کر زمین پر بہنے لگا۔ سایہ پھیل رہا ہے آہستہ آہستہ دہکتی چھریاں اس کے ماس کو جلا رہی ہیں۔ آہستہ آہستہ کاٹ رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ —— وہ کرب میں چیخ رہا ہے۔ چلا رہا ہے ——

لیکن بہتے ہوئے ماس کو چھریوں کے وہ گنے دوگنے پھل کاٹ رہے ہیں، اور تاحدِ نگاہ اس کی بوٹیاں پھیلتی چلی جارہی ہیں، اور اُس کا سر آسمان پر جلتے آگ کے گولے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آسمان سے گرتی آگ سر کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کونے میں کھڑے کھڑے اس کی سانس تیز ہو گئی۔ اس آگ کو روکو، میری ایک ایک بوٹی میں دماغ ہے، سر کو آگ کی طرف بڑھنے سے روکو ورنہ .... میرا نچلا دھڑ پتھر ہو گیا ہے —— ہل نہیں سکتا —— ماں — ماں — بڑھ کے آگ کو روکو — ماں — میرا سر اس نے آنکھیں بند کر کے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا —— آگ نے سر کو چھوا، وہ چیخ اٹھا —— "مر گیا ماں" ——

"کیا ہوا میرے بیٹے، میں واری جاؤں۔" "ماں میرا سر"

"ہائے میرا جوان جہان بیٹا، نہیں ضرور کسی جن بھوت کا سایہ ہو گیا ہے، آج تم پھر خواب میں ڈر گئے ہو۔ صبح ہوتے ہی تعویذ جا کے لے آؤں گی۔"

"لیکن تعویذ والا ہاتھ غائب ہو گیا ہے اور میرا ہاتھ بھی کلائی کے ساتھ کٹ [illegible] ہے اور میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ چھری میرے پاس نہیں، اسے جن نے قتل کیا ہے —— اس نے تاریک کمرے سے جھانک کر سرخ دھوئیں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سامنے جن کا سایہ ہے —— سرخ سرخ دھواں بن کر پھیل رہا ہے —— وہ دیکھو —— وہ دیکھو اسی کے ہاتھ میں چھری ہے ——" اسے میں نے قتل نہیں کیا ——

"یہ تو ثابت ہو چکا ہے۔" —— مجسٹریٹ نے زیرِ لب کہا ——

"لو سگریٹ پیو۔" داروغہ بولا۔

مسکراؤ۔ آخری وقت چہرے پر سکون ہوا کرتا ہے۔ خاکروب نے زیرِ لب

کلمہ بھی پڑھا۔

"ہم پھانسی کو کب تک پہنچیں گے؟"

"شاباش خاکروب نے دل میں کہا"

"وہ سامنے جو کھٹا ہے۔ دس بیس گز کے فاصلہ پر۔"

اور مجھے کمرے سے نکلے صدیاں بیت گئی ہیں۔ لیکن چوکھٹا نظر نہیں آتا۔

آنکھوں نے آسمان کی سب سے اونچی لہر پر چڑھ کر دیکھا۔ اور دوسری لہر

میں اتر گئیں۔ یہاں چاروں اور پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی دھند ہے۔ میں سیڑھیاں

اتر رہا ہوں۔ لیکن زمین نہیں آتی۔ سیڑھیاں چڑھ رہا ہوں۔ لیکن آخری سیڑھی

کے بعد ایک اور سیڑھی ہوتی ہے۔ میں بہہ رہا ہوں لیکن میرے پیر سینے پر جمی

دھند کی تہ میں کھو گئے ہیں اور دیواروں میں غاروں کے منہ ہیں۔ کمرے کا

دروازہ پھر اسی کمرے میں کھلتا ہے۔ یہی کمرہ دن ہے جو پلک جھپکنے گزر جاتا

ہے۔ یہی غار رات ہے جو ربڑ کی طرح تنتی ہی چلی جاتی ہے۔ نیند رکنے

سے بھی نہیں رکتی، بندر کے ساتھ ہی گزرتا ہوا دن سیاہ لبادے میں بڑے

بڑے دانت نکالے آجاتا ہے اور رات اور بھی لمبی ہو جاتی ہے۔

اور میں دیکھتا ہوں کہ ایک میدان میں بہتے سرخ دریا کے کنارے چلتا

جا رہا ہوں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کا پانی کیوں سرخ ہو رہا ہے۔ میدان

میں دور دراز درختوں کا نشان نہیں چلتے چلتے مجھے قہقہوں کی آواز سنائی

دینے لگی ہے۔ جو رفتہ رفتہ میری قریب ہوتی جا رہی ہے ؛ اور قریب۔ بالکل میری بائیں طرف —— میں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا۔ میرے بالکل قریب بڑی بڑی سوکھی شاخوں والا درخت ہے۔ جس کی ہر شاخ کانٹا ہے ؛ اور ہر کانٹا میرے کٹے ہوئے سر میں پیوست ہے۔ اور انہی سے خون گر رہا ہے ؛ قطرہ قطرہ اور یہیں سے دریا کا پانی لال ہو رہا ہے۔ درخت کے تنے کے پیچھے سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ میں نے درخت کی اوٹ سے دیکھا، تو وہاں —— وہاں۔ —— کتابوں کے تخت پر اخباروں کے کاغذوں سے بنا کوئی جسم بیٹھا پاگلوں کی طرح ہنس رہا ہے۔ میں اسے غور سے دیکھتا ہوں تو اس کی شکل بالکل بازار کی نکڑ والے لالے کی طرح ہے۔ اسی طرح بودی بھی اس کے سامنے میری لاش پڑی ہے۔ اور وہ بار بار انگلیوں سے میری شہ رگوں سے کوئی شئے نکالنا چاہتا ہے۔ میں اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھانے کی کوشش کرتا ہوں، مگر مجھ سے ہلا نہیں جاتا، اس نے میری شہ رگوں کو خالی کرنے کی کوشش سے تنگ آ کر مجھے کتابوں پر لٹا دیا اور کتابوں کو آگ لگا دی۔ میرا دھوئیں میں دم گھٹ رہا ہے۔

مجھے بچاؤ —— ماں —— مجھے سانس نہیں آتا۔ —— میرا دم —— ماں —— پانی —— "

" لو میرے بچے لو۔ "

" ماں یہ جو میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا —— یہ سایہ "

گلے کی زنجیر میں ایک اور تعویذ۔

"ماں دن کو تو میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"تم کوئی نیک کام کرو۔ تو تعویذوں کا کوئی اثر بھی ہو۔"

"ماں وہ لکڑی پر ریڑی والا لالہ میرے خوابوں میں کیوں آتا ہے"

"تم اس دکان کی طرف نہ جایا کرو۔ کوئی نقصان نہ پہونچا دے۔ تم خواہ مخواہ اس سے جھگڑا مول لیتے ہو، بازار میں اور اتنے ڈنگرے کیا کم ہیں۔"

"تم نہیں جانتیں ماں۔ وہ اسے بڑی بڑی گالیاں دیتا ہے، جو ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے اور اسے بھی جو ہمارے دل میں دھڑکتا ہے۔ مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ میرا یار بیٹھک والا کہہ رہا تھا۔ کہ"

"تم نہ ان لفنگوں، حرامزادوں کے ساتھ بیٹھا کرو۔ انہی قاتلوں کو اس سے نپٹنے دو۔"

وہ مسکرایا —— "میں نے تو آج تک مرغی بھی حلال کر کے نہیں دیکھی ماں"۔ لالے کو وہ خود ہی سنبھال لیں گے۔ لیکن یہ کمبخت مجھے کیوں ڈراتا ہے عجیب جن چمٹا ہے۔ خواب اس کے ذہن میں پھر گھوم گیا۔ اس نے تعویذوں پر ہاتھ رکھا اور اسے آیت الکرسی جتنی یاد تھی پڑھ کے سینے پر پھونک ماری اور سو گیا۔

ماں کی ہدایت کے باوجود صبح بیٹھک کی طرف آتے وہ لالے کی دوکان کے سامنے ہو کر آیا تھا، اور ہنستے ہنستے یاروں کو سارا قصہ سنایا تھا۔ باتیں کرتے کرتے وہ یکدم خالی الذہن ہو کر چپ ہو جاتا۔ کوئی کہتا "پھر" اور بات پھر جاری ہو جاتی۔

"یار کہیں واقعی مجھے جن نہ چمٹ گیا ہو" اس نے یکدم سنجیدہ ہو کر کہا۔"

"ویسے اس لالے کو ٹھکانے لانا تو بڑے ثواب کا کام ہے۔ سنا ہے اب اس نے تیتروں سے بھری کوئی کتاب لکھی ہے۔"

"میں بتاؤں، کسی سے ان خوابوں کی تعبیر پوچھو۔ ہمیں تو ایسے سپنے کبھی نہیں آئے؟"

"تعبیروں کو مارو گولی۔ کسی طرح میرا ان سے پیچھا چھڑاؤ۔"

"اچھا سب سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم سارا دن کیا سوچتے رہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں —— کیوں؟"

"تو پھر اس کا علاج بھی نہیں۔ اگر تم سوچتے ہوتے تو سیدھا سا علاج تھا۔ تم وہ کچھ سوچنا بند کر دیتے اور۔"

ہنسی

یار میرا مذاق نہ اڑاؤ —— میں بہت پریشان ہوں"

"تو پھر لگے دم، مٹے غم"

اس نے سگریٹ کا دم لگایا اور غم کو مٹاتے مٹاتے لمبی چپ میں اتر گیا۔

واقعی میں سارا دن کیا سوچتا رہتا ہوں؟ —— کیا کرتا رہتا ہوں؟ —— میں سوچتا رہتا ہوں کہ وقت کیسے گزارا جائے۔ اور کرتا یہ رہتا ہوں کہ وقت گزارتا رہتا ہوں —— بڑی سیدھی بات ہے

وہ ہنسا۔

اسے آئندہ سگریٹ بھر کے نہ دیا کرو۔ اسے غم نہیں ہوتے۔

اب یہ ذرا ٹھہر کے ہی واپس آئے گا۔

واپسی پر جوا —— پھر شراب —— کوٹھے پر گانا ——

اور پھر پل بھر میں گزرا ہوا، سیاہ لبادے میں دانت نکالے دن - جن کا سایہ رات
ربڑ کی تنتی ہوئی لمبی - اور لمبی، پیروں میں بندھے گھنگھروں سے لالے کی ہنسی
کی آواز اور سازوں کے گلے میں آندھیوں کا شور ——— ہا ہا ہا ہا ——— شوں
شوں ——— جنگل میں درختوں کا شور اور گرد و غبار میں ابھرتی مٹتی خوفناک شکلیں
وہ زمین کے ساتھ چپک کر رینگ رہا تھا۔ پر میں اتنا چھوٹا کیوں ہو گیا ہوں، اور یہ
مجھ سے تیز کیوں نہیں چلا جاتا۔ اس نے بھاگنا چاہا۔ لیکن پھر فوراً ہی گھاس کی پتی
سے چپک گیا۔ آندھی، گردے کی چڑیلوں کے دانتوں سے زیادہ تیز تھی۔ وہ
پھر زمین پر اتر آیا اور رینگنے لگا اور رینگتے رینگتے اس کا جسم دکھنے لگا۔ اس کے
گرد چڑیلوں کا ناچ تھمنے لگا اور اس نے دیکھا وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے،
کوئی زنجیر کے دوسرے سرے سے اسے کھینچ رہا ہے، کھینچنے والا اسے نظر
نہیں آتا۔ چڑیلیں ناچتی ہوئی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں جب وہ انہیں غور
سے دیکھتا ہے تو ان کے چہرے کا ماس سکڑتا سکڑتا برادہ بن کر ہوا میں اڑ جاتا ہے
اور ان کے دل کی جگہ پر بغیر سوئیوں کے گھڑیاں ٹک ٹک کرنے لگتی ہیں ہر قدم پر
ہنسی کی آواز بڑھتی جاتی ہے۔ اور وہ چلتا جا رہا ہے، جنگل کی بھول بھلیوں
میں چلتے چلتے یک دم سب کچھ رک جاتا ہے، وہ نظریں اٹھا کر سامنے دیکھتا
ہے تو زنجیر کا دوسرا سرا لالے کے ہاتھ میں ہے، قریب بہت بڑا الاؤ جل رہا
ہے، جس کے گرد لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک کے آگے کتابوں کا انبار
لگا ہے، اور کچھ وقفے کے بعد ایک کتاب اٹھاتا ہے اور الاؤ میں پھینک
دیتا ہے۔ لالہ مسکراتا ہوا اس کی زنجیریں کھول دیتا ہے اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتا

ہے۔ وہ لوگوں کی طرف دیکھتا ہے، تو اس میں اس کا دوست بھی بیٹھا نظر آتا ہے، وہ اس کے پاس بیٹھ جاتا ہے، اور دوست اسے اشارہ کرتا ہے: یہی' وہ کتاب ہے۔ اس کی کنپٹیاں پھڑکنے لگتی ہیں اور وہ بڑے غصے میں لالے کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ آگ کے بالکل پاس پڑی ہوئی ایک لاش ملتی ہے، جس کے سینے سے لالہ چھری سے دل نکال رہا ہے۔ یہ میں ہوں؟ دوست اثبات میں سر ہلا دیتا ہے، لالہ دل نکال کر اس کی بوٹی بوٹی کر کے کھا جاتا ہے پھر شہ رگ کو منہ لگا کر خون پیتا ہے۔ پھر لاش کا سر کاٹ کر آگ کے گرد پھرنے لگتا ہے ایک چکر — دو چکر — سانویں. چکر پر سر آگ میں، بغیر سو بتوں کے گھڑیوں والی چڑیلیں بھی کہیں سے آگ کے گرد ناچنے لگتی ہیں — چوتھا چکر — پانچواں — تم اٹھتے کیوں نہیں یہ تمہارا سر ہے۔ اسے لالے سے چھین کر لالے کو آگ میں پھینک دو۔۔۔

اٹھو — اٹھو — زندگی میں ایک کام تو کرو۔

اپنے آپ کو تو بچاؤ — تمہارے دل کی دھڑکن، تمہاری شہ رگ سے بھی قریب۔ لالے کے منہ سے خون بہ رہا ہے، یہ چھٹا چکر ہے۔

اٹھو اٹھو اس نے پھر دوست کی طرف دیکھا۔ دوست نے اشارہ کیا۔ وہ لپک کر اٹھا، اور لالے سے گتھم گتھا ہو گیا۔ اسی چھینا جھپٹی میں اس نے اپنا سر لالے کے ہاتھ سے چھوٹ کر آگ میں گرتے دیکھا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

تم لالے سے جھگڑے میں لپٹے رہتے ہو — میں تو جانوں اسی نے جادو

کر دیا ہے۔

میرا دل، میری شہ رگ، وہ چپ تھا۔

"سارا دن جانے کیا سوچتے رہتے ہو بےکار۔ فارغ بھی برے نجانے کا گھر ہوتا ہے —— اور کیا سارا سارا دن کام نہ کاج ——
زندگی میں ایک کام تو کرو۔ اپنے آپ کو تو بچاؤ، کچھ تو کرو، تم نے آج تک کیا کیا ہے،؟"

"نہیں میں نہیں کھیلوں گا، مجھے پتّے نہ دینا۔"

"رات پھر سقّا آیا ہے۔"

"میری مانو تو بھنگ پینا چھوڑ دو۔"

"وہ ان کو کھیلتا چھوڑ کر بازار میں آ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کرے اور کدھر جائے۔ وہ تھڑے پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں بازار کی نکڑ پر کچھ دیر کے لئے رکیں اور پھر بازار میں بھٹکنے لگیں۔ میں کیا ہوں۔ وہ بازار میں یک دم تنہا ہو گیا۔ میں نے آج تک کیا کیا ہے ؟ — سارے بازار میں کٹی ہوئی زبانیں پڑی تھیں۔ زندگی میں ایک کام کرو۔ اپنے آپ کو تو بچاؤ۔ میں نے آج تک کیا کیا ہے ؟ —— میں کیا ہوں —— مجھے اپنے آپ کو بچانا چاہیے، میں لالے کو یہ ثابت کر دوں گا کہ میں ہوں، اور میرا دل کاٹنے اور شہ رگ سے خون پینے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اور میں پھر ماں کو بتا دوں گا، کہ میں بےکار نہیں ہوں، مجھے زندگی کتنی پیاری ہے، بےکار لوگوں کو زندگی پیاری نہیں ہوتی —— اور دیکھو میں اپنی زندگی بچا کے لایا ہوں —— لیکن کس طرح کیوں کر

. . . . تھڑے پر بیٹھے بیٹھے، اس کا سر چکرانے لگا اور وہ سڑک پر اتر آیا

بازار میں لوگ مصروف تھے، وہ دبے پاؤں چلتا ہوا بازار کی دوسری نکڑ تک گیا اور کنکھیوں سے دوکان کی طرف دیکھا۔ لالہ بیٹھا ردی تول رہا تھا۔ اس کو جھرجھری آگئی، وہ بازار کا چکر لگا کے پھر لالے کی دکان کے سامنے تھا، لالہ ہنس ہنس کر گاہکوں سے باتیں کرتا تھا۔ اس نے اپنے کانپتے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں جکڑ لیا، اور قصائی کی دوکان پر آگیا۔ قصائی قیمہ بنا رہا تھا۔ قصائی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ اسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ میں ٹوکا ہے جو بار بار لکڑی کی مڈھ پر گرتا ہے، اور اس کا دوسرا ہاتھ گوشت کو لکڑی اور ٹوکے کے درمیان کھسکاتا رہتا ہے۔ اس نے اس سارے عمل کو بڑے غور سے دیکھا، پھر اس کے باہر کیل پر لٹکے ادھ کٹے بکرے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے قصائی سے مرغی ذبح کرنے کے لئے چھوٹی چھری ادھار مانگی . . . .

ہاں۔ میں نے چھری مانگی تھی۔ اس نے خون میں گری چھری اٹھا لی۔ اس کے گرد سرخ دھواں دبیز ہو گیا۔ پھر میں اسے ڈب میں اڑس کر پاگلوں کی طرح بے مقصد پھرتا رہا تھا۔ دربار پر بھی گیا تھا، اور چھری سے ربڑ کا قیمہ بھی بناتا رہا تھا۔ وہ لاش کو دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے اٹھا —— اور پھر میں نے شراب پی لی تھی اور پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا تھا، جسم مجھ سے علیحدہ ہو گیا تھا اور سائے کے ہاتھ چھری تھی اور یہ —— اور یہ سب کیا ہے میرے

کپڑوں پر یہ خون کیسے سوکھ گیا ہے۔ میں یہاں کیوں ہوں۔ یہ چھری تو میں قصائی
سے لایا تھا۔ تو یہ کتنا خوف ناک نظارہ ہے، خون، لاش اور کٹی ہوئی گردن
اور چھری میرے ہاتھ میں —— اور میں بالکل سلامت ہوں —— آج یہ
میرے خواب میں نہیں آئے گا۔ میں ابھی جا کر ماں کو بتاتا ہوں —— سائے نے
قتل کر دیا ہے سائے کو۔

"لالہ قتل ہو گیا ہے"

"اچھا —— کس نے کیا؟"

"اس نے —— اس نے" اس نے تاریکی کی طرف اشارہ کیا۔

"اور چھری تمہارے ہاتھ میں ہے،" دوسرا آدمی بھاگ کھڑا ہوا۔

یہ میں نہیں ہوں —— وہ بھاگنے لگا —— جلدی جلدی سیڑھیاں
اترنے لگا —— میں سیڑھیوں کے قید خانے سے نکلنا چاہتا ہوں۔ یہاں
دھند میں میرا دم گھٹ رہا ہے، سرخ رنگ میں تیز دانت ہیں یہ میں
نہیں ہوں —— بازار میں لوگ سر جھکائے کیوں پھر رہے ہیں؟ کس کے
جنازے کے ساتھ ہیں۔ اس نے چیخ کر کہا، لالہ قتل ہو گیا ہے۔ تھڑے کے
نیچے سے کتا بھونکنے لگا۔ "وہ دکان میں۔ وہ دکان میں" اس نے کتے
سے کہا "خون ہو گیا ہے۔ بازار میں بازگشت تھی۔ کتے نے جیسے سنا ہی نہیں
اور دوسرے تھڑے کے نیچے چلا —— تم سنتے کیوں نہیں۔ اس نے
لوگوں سے کہا —— سائے نے سائے کو مار دیا ہے۔ کسی نے سر اٹھا کر نہ
دیکھا۔ سب چلتے جا رہے تھے —— سو وہ قتل ہو گیا —— لوگ قدم آہستہ آہستہ

آہستہ — دیکھو، دیکھو — میرے کپڑوں پر خون ہے۔ لیکن یہ میرے جسم پر نہیں ہیں — میری طرف دیکھو تو سہی — ہاتھ میں چھری ہے۔ لیکن یہ میرا ہاتھ نہیں — خدا کے لئے میری طرف دیکھو۔ اچھا — اچھا — یہ قتل میں نے کیا ہے — ادھر دیکھو تو۔ لوگ رک گئے — انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا — ہاں ہاں یہ میں ہوں بے کار آدمی — اس نے سینے پر ہاتھ مارا۔ اور چھری اٹھا کر ان کے سامنے کر دی۔ سیاہ آستین کے منہ میں بال تھے اور بالوں کے ساتھ اس کا کٹا ہوا سر لٹک رہا تھا — نہیں — نہیں — وہ الٹے پاؤں چلتا چلتا مڑ کر بھاگنے لگا — یہ بھی خواب ہے؟ — بازار نعروں سے گونج اٹھا — زندہ باد — لوگ گیت گانے لگے — اس نے کانوں میں انگلیاں دے لیں — ماں ماں — دروازہ کھولو۔ —

ماں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ماں میں نے آج زندگی حاصل کی ہے۔

ماں اس کی قمیص پر پڑے خون کے چھینٹے چن رہی تھی۔

ماں سایہ قتل کر کے بھاگ گیا ہے۔

میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ہولے سے کہا۔ اور ماں کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

ماں نے اس کے سر پر تھپکی دی، اور اپنے کندھے سے اس کا سر اٹھایا۔

کمبخت، تمہیں یہ نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ تھا کہ جب تم نے اسے اپنے دل میں

لگا دی ۔

" ہم پہنچ گئے ہیں " — دارو غے نے کہا —

" کہاں ؟ " — اس نے دارو غے کو دیکھا ، اور پھر سر گھمایا

پیچھے دھند ہی دھند تھی — دور — اور دور — اور اس کے

سامنے دیوار تھی — اور دیوار سے ذرا ہٹ کر —

فلاں ولد فلاں — دور دھند سے آواز آئی — پاس کھڑا مجسٹریٹ

کاغذ پڑھ رہا تھا ۔

لوگوں نے تو مقدمہ جیتنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی — سنا تھا

کہ مجھے زیادہ سے زیادہ عمر قید ہو گی ۔ لیکن میں چپ تھا ۔ میرے بیٹے ہیں

تمہیں خود نہلا دھلا کر کپڑے پہنا کر بھیجوں گی ۔

چونکہ تم ہی کہتے ہو ، میں نے تو زمانے سے نجات حاصل کی ہے ۔ "

شہید کون ہو گا — یہ تو چھری نے کہا تھا کہ میں بھی ہوں ۔

مجرم بولتا کیوں نہیں ۔ ؟

جو مجرم ہو گا ، بولے گا ۔

اس لئے عدالت اسے سزائے موت کا حکم — سیاہ آستین کے منہ میں

پیراشوٹ ہے ۔ اور میں چپ رہوں ۔

یہ دنیا کس لئے گیت گا رہی ہے — مجھے گیت نہیں چاہئیں — ورنہ

لاؤ — ماں دنیا کہاں ہے — مجھے چھوڑ دو — مجھے چھوڑ دو

میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی ۔

شاباش — شاباش — اسی طرح سکون سے مسکراتے ہوئے —
خاکروب مسکرایا۔

میں مرنا نہیں چاہتا — خدا کے لئے مجھے بچاؤ — میں نے قتل
نہیں کیا — وہ تو سایہ تھا — سایہ

"تمہاری آخری خواہش ؟"

میری آخری خواہش ؟ — آسمان سے میری آنکھیں اتار لاؤ مجھے
روشنی چاہیئے۔

"ٹھیک ہے" — ڈاکٹر نے نبض دیکھی۔ —

"میری آخری خواہش، مجھے میرا وجود دکھاؤ — میرے ہاتھ کی چھری
کے نیچے سے میری گردن نکال لو — مجھے نہ مارو — میری آنکھیں بھنور میں
اتر رہی ہیں — مجھے بچاؤ۔

شاباش غازی — خاکروب کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی — کلمہ
پڑھو۔

"میری آخری خواہش ؟" — اس نے اپنے آپ کو اپنے سے چھڑانے
کی پھر کوشش کی۔

شاباش شہید — مسکراؤ — خاکروب کا دل مچلا —

"میری آخری خواہش ؟" — اس نے چیخ کر کہا — یہ پھندا فوراً میرے
گلے میں ڈال دو — ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔"

آسمان کے بھنور میں اترتی آنکھوں کے تاگے تنتنے ٹوٹ گئے

اور آسمان کی تہہ سے کھلتی آنکھوں نے دیکھا۔
پہرے دار اس کوٹھری کے آہنی دروازے کا تالا کھڑکا کے دیکھ
رہا ہے کہ لگ گیا ہے یا نہیں ـــ لگ گیا ہے ـــ سورج پر تالے کی ضرب
چیخیں اور آہنی سورج کے درمیان گول آنکھ کے اندر ایک اور آنکھ آکے
تاریک ہو گئی۔

مرگی

جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ وہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔

اس نے آنکھیں مل کر کر لوزی کے ننگے آئینے میں چاروں اور دیکھا۔ بھیگی ہوئی پتلیوں میں شیشے کی کرچیاں تھیں۔ اس کی نظریں سمندر کے چکنے کنارے پر بھاگتے ہوئے کیکڑوں کے پیروں میں الجھ الجھ کر ٹوٹنے لگیں تو مجھے پھر دورہ پڑا تھا؟ —— اس نے اپنے ٹوٹتے ہوئے جسم کو کانپتے گھٹنوں پہ سیدھا کرنے کی کوشش کی —— کیا ہوا تھا؟

میں ٹرام میں بیٹھا تھا۔ ٹرام کسی چیز سے ٹکرائی تھی۔ پتہ چلا کہ کوئی ٹرام کے نیچے آ گیا ہے۔ ٹرام رک گئی تھی۔ چند ایک متجسس لوگوں کی گردنیں ٹرام کی کھڑکیوں کے باہر جھانک رہی تھیں۔ کیا ہوا ہے —— ٹرام کے سارے مسا

نیچے اتر گئے تھے۔ اور تیز تیز قدموں سے بس شاپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔
سڑک کے درمیان میں ٹرام کی پٹریوں پر ٹریفک رک گئی تھی۔ ساتھ والی پٹڑی پر
مخالف سمت میں جانے والی ٹرام دندناتی ہوئی گزر رہی، رکشا، بسوں، موٹروں
کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ لوگ اپنے کاموں میں مصروف آجا رہے
تھے۔ ٹرام خالی ہو گئی تھی۔ کیا مصیبت ہے، پہلے ہی دفتر سے دیر ہو گئی ہے
اب جانے بس میں جگہ بھی ملتی ہے یا نہیں۔ میں ٹرام سے اتر کے آگے کو بڑھا تھا۔
اور میری نظریں غیر ارادی طور پر ٹرام کے پہیوں کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ ایک
بہت خوبصورت نکرانی لڑکی کچلی پڑی تھی۔ اس کا خون اس کی رلٹوئی سے بہتے
دودھ میں پگڈنڈیاں بناتا سڑک اور پٹڑی کی دہلیز پر جم رہا تھا۔ فٹ پاتھ کی
طرف بہہ رہا تھا۔ اس کی چھاتیاں پھٹے ہوئے گریبان میں تڑخ گئی تھیں۔ پاس
کنڈکٹر اور ڈرائیور کھڑے تھے اور ٹریفک کا ایک سپاہی، رکشا، موٹریں،
بسیں۔ لوگ آجا رہے تھے۔ میں ایک لحظہ کے لیے بھی رکے بغیر سیدھا دفتر کو
چل دیا تھا۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی تھی۔ بس کا انتظار کون کرتا۔ اور پھر جانے جگہ
بھی ملتی یا نہ —— نہیں اس واقعے کا اثر نہیں تھا۔

تو پھر ؟

دفتر میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ پرانے مشینوں میں ڈھل ڈھل
نکل رہے تھے۔ میں نے بڑے اطمینان سے اپنی اسسٹنٹ کا دورہ لگایا تھا۔
اور کمرے میں آکر کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ میں نے چائے کے دوسرے دور
میں پورا اخبار پڑھ لیا تھا اور تیسرے دور میں ناول کا ایک باب۔ یہ دن بھی

دوسرے دن کی کاربن کاپی تھی تو آج پھر یہ دورہ کیوں پڑا۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ خوش بھی تھا۔ مالک نے میرے کام سے خوش ہو کر میری تنخواہ میں اضافے کا وعدہ بھی کیا تھا جس سے میری شادی کے امکانات روشن ہو گئے تھے آئندہ سال میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ اپنے کسی رشتہ دار سے کہہ کہا کر شادی کا بندوبست کرا سکوں۔ پھر میں پوری طرح سیٹل ہو جاؤں گا۔ نادار ہونے کی حیثیت سے میرے رشتہ دار میری بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے اور مجھے اس سے بھی کبھی کوفت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن پھر کبھی کبھی مجھے یہ کیا ہو جاتا ہے۔

اس نے قریب سے بھاگتے ہوئے چھوٹے سے کیکڑے کو مار کر ریت میں گاڑ دیا۔ اس کے جسم میں کانٹیں لوٹ رہی تھیں۔

"کیوں ؟"

اچھا بھلا دن گزر رہا ہوتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے یکدم اسے جانے کیا ہو جاتا کہ پتیوں میں زلزلہ آجاتا۔ اس کی آنکھیں ساری کائنات کے ملبے میں ڈوب جاتیں جب اس کا احساس لوٹتا تو وہ ذکرلوں کی انی پہ تڑپ رہا ہوتا۔

وہ گرتا پڑتا اٹھ کھڑا ہوا اور سمندر کے کنارے بھاگنے لگا۔ پیروں میں پڑتی سمندر کی زنجیریں توڑتا ہوا، ہانپتا ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ بہت زور سے چیخے۔ اس نے چیخ ماری۔ آواز سمندر کی چیختی چپ میں ڈوب گئی۔

وہ ہنسا اور ہنستا رہا!

ننھی منھی تارا مچھلیوں اور گھونگھوں نے سکٹ کر پہن لئے۔ پانی کی پیگھلتی ڈالن پہ چٹانوں کو جھنکار سے اڑاتی سمندر سے اٹھی اور اس کے جسم میں لڑائی کے

وائٹ گارڈ کے بلبلوں میں پھوٹ پڑی۔۔ وہ بھاگتا بھاگتا رک گیا اور غصے میں بلبلوں کو ٹھوکریں مارنے لگا۔ تم چپ کیوں ہو؟

ڈاٹن پھر اٹھی، اور بانہوں کی پھانسی سے اس کی طرف بڑھی (اس کا سانس چھین کر اسے گیلی ریت میں اچھال دیا۔ مجھے چوٹ نہیں لگی۔ کوئی زخم نہیں آیا کیوں؟ اس نے مڑ کر سمندر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خلش تھا۔ بے بسی تھی۔

دیکھا! میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ دور وہ مجھ میں نہیں سمندر میں ہے۔ میرے ارد گرد ہے۔ میں اس کے اندر ہوں۔ اس نے ہوا سے سانس چھینے اور مٹھی بھر کے مٹی اپنے جسم پر مل لی۔ یہ میرا زخم ہے، یہ زخم چھین کر میرا جسم بن گیا ہے۔ یہ زخم بے حس ہے۔ اس میں کوئی جلن نہیں (جلن کیوں نہیں؟) اس نے آسمان کو گھورا، پھیکے سے آسمان میں پرانے زخموں کی سڑاند تھی (یہ بو مجھے آ رہی ہے؟)

اس کے پیر پہ سنہری چیونٹی نے کاٹا۔ وہ بلبلا اٹھا۔ یہ تو میرا پیر ہے۔ اس نے جھک کر چیونٹی کو وہیں مسل دیا۔ پھر دوسری چیونٹی پھر تیسری۔ اس کے تمام پیر پر چیونٹیاں چمٹی ہوئی تھیں (میرے جسم کے تمام ریشے کب ڈھیلے پڑیں گے؟)

دور سے آواز آئی (ہوا کی سرسراہٹ؟ ـــ درختوں کی سرگوشی؟ سانپ کی پھنکار؟ ـــ پرندے کی سیٹی؟) یہ آواز کیسی ہے؟ مجھے آواز آئی تھی۔ اس نے ہوا انگلی کر کانوں کے پردوں کو سرکایا۔ سر! ـــ یہ تو ہوا اپنے کاندھے پر سر کو بٹھا کے لائی ہے۔ اس کے کئی ریشے ڈھیلے پڑ گئے۔ سروں نے اس کے کانوں کے پردوں پہ ایڑیاں ماریں۔ جیسے چشمے پھوٹ پڑے اور اس کا سارا

تناؤ گھل گیا۔ مجھے اس گیت کی آواز آ رہی ہے۔ میں یہ آواز اس لئے سن رہا ہوں کہ میں بھی آواز کے سمندر کی ایک لہر ہوں۔ وہ چٹان کی اوٹ میں ٹھنڈی ٹھنڈی گیلی ریتیلی مٹی پر سیدھا لیٹ گیا۔ بھیگی مٹی کا ایک قطرہ اس کے ہر خلیے میں سرایت کرنے لگا۔ ہر ہنستی کھیلتی لہر دوسری لہر کو پھلانگتی۔ چٹان سے ٹکراتی۔ پھوار اس پر آ کے پڑتی (لہر کا خون) میں بھی کیوں نہ تھوڑا سا خون بہا لوں تاکہ شریانوں میں لہو کے بجائے اچھی طرح خلا رچ جائے، لیکن اس کا جی اٹھنے کو نہیں چاہا۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور موت کے سکوت میں پہلا قدم رکھ دیا۔

(تم اپنا علاج کراؤ۔ تم ایسا قابل اور محنتی لڑکا، . . .)

(ہوں۔)

کئی دفعہ دھوپ آسمان سے اتر کے اونچی اونچی عمارتوں کی سب سے آخری اینٹ سے پھسلی تھی۔ اس کے حلق میں پھنکی تھی اور دھوپ کا کانٹا اس کے تالو میں اٹکا تھا جس وقت اس کانٹے کی ڈوری ہلتی تھی تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ خود ہے تو سہی۔ لیکن دھاگے کی جڑیں کہاں ہیں۔ کانٹا تو پھل ہے، دھاگا۔ جڑیں، دھوپ، عمارتیں، مشینیں پرندے۔ لفظ، الفاظ—— سیاہ الفاظ جو سفید کاغذ پر آ کے سفید ہو گئے تھے۔ سفید الفاظ جو سیاہ بلیک بورڈ پر اتر کے سیاہ ہو گئے تھے اپنا مطلب گنوا گئے تھے۔ اور لفظوں، ناموں کے ساتھ تمام چیزوں کا مقصد بھی، لوگوں نے حوالوں سے چیزوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ جاننا چاہا لیکن سوچ کے لاوے کلبل کلبل کرتے رہے۔ انہیں پر نکلے۔

"تم میں اچھی خاصی تخلیقی صلاحیتیں ہیں۔ اگر ذرا توجہ کرو تو نئے جیز بٹروں کے ڈیزائن (

لاروؤں کی کرہلاہٹ، ان کے ہلنے کی سَر سَر ——— مجھے خوف آتا ہے، تو میں بھی ہوں جو کبھی اس گزاری کے دانت میں آتا ہوں، اور نہ کبھی اس میں، نہیں، یہ دانت تو نہیں۔ یہ تو موت کے سکوت کی مسلسل داب ہے۔ جو لمحوں میں منقسم ہے

(ڈیئر) میں بالکل ٹھیک ہوں سَر، بس یہ کبھی کبھی ذرا سا")

نہیں یہ سب کچھ، کچھ نہیں ہے۔

اس کے سن چہرے پر حرارت کے چٹاخ پڑ گئے۔ اس نے اپنی آنکھوں کے روزنوں سے دیکھا۔ چٹان کا سایہ، آسمان کی چھت، دور پام، اور کھجور کے درخت، ان کے قدموں میں آگ کے پودے۔ پودوں کے قریب جھونپڑوں کی جھپنیں (اور دور افق پر عمارتوں کی چوٹیاں، مسجدوں کے گرجوں کے کلس) دھاگے کی جڑیں۔ (یہ مجھے پھر کیوں یاد آگئیں، اوہ، کسی نے ڈوری ہلائی ہے اور کانٹا ——— (جڑیں کہاں ہیں؟) یہ سب موجود ہیں اور ریت میں ذرّے۔ یہ سب مجھ پر چھائے ہوئے ہیں۔ نہیں سب کچھ، کچھ نہیں ہے۔ صرف میں ہوں!؟)

کسی نے پھر مجھے چھوا ہے۔

(۶)

اس نے کراہ کے آنکھیں موند لیں (میں نے زندگی میں کسی چیز کی بھی کمی تو محسوس نہیں کی۔ میری یہ حالت کیوں ہو جاتی ہے۔ میں نے دنیا میں اتر کے دیکھا ہے ہر متحرک چیز کے ساتھ قدم ملا کر چلا ہوں، وقت تک کے ساتھ دوڑا ہوں۔ پھر یہ سب کچھ میرے رستوں میں آ کے یکدم رک جاتا ہے!)

کسی نے پھر اس کے چہرے کو ہلایا۔

"آنکھیں کھولئے نا"

اس نے پوری آنکھیں کھول کر یکدم بند کر لیں (اور آنکھوں میں رنگ، جھکا ہوا، عکس اور احساس بھی)

"آپ کو کیا ہو گیا تھا ؟"

نہیں نہیں

"آپ چٹان سے ٹکرا گئے تھے۔"

نہیں

"آپ آنکھیں کیوں نہیں کھولتے" (باریک سی روہانسی آواز)

مجھے آواز واقعی سنائی دی ہے۔ مجھے واقعی کسی نے چھوا ہے۔ مجھے واقعی مینٹ کی خوشبو آ رہی ہے۔ میری آنکھوں میں اس کا عکس بھی ہے۔

"اُف" — میرے جسم سے یہ درد کبھی نکلا بھی تھا؟ وہ کہنیوں کے سہارے بیٹھ گیا —

"آپ بیہوش ہو گئے تھے۔"

اس نے لڑکی کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ بھی مجھے دیکھ رہی ہے۔

"ہم پکنک منانے آئے ہیں — اس نے دور جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں گراموفون ریکارڈ اب بھی بج رہے تھے — میں سیر کرتی ادھر آ نکلی تھی۔

"آپ۔ آپ کو کیا ہو گیا تھا۔ ؟"

"اف" — اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"آپ کچھ بتائیں تو . . . . . "

"مجھے سمندر (ـــــ

"اگر میڈیکل ایڈ کی ضرورت ہو تو ـــــ"

(ـــ کی یا ہنوں نے بھیج دیا تھا۔)

میموں کی طرح کٹے بال۔ کالی ساڑھی۔ بغیر بازو، اور گہرے چاک کے گریبان والا سرخ بلاؤز۔ بغلوں کے بالوں میں اٹکے ہوئے پسینے کے قطرے گریبان کی اوٹ سے جھانکتی۔ دودھیا چھاتیوں پر پھسلتی نظروں کی زبان پر کانٹے پڑ گئے۔ اس نے تھوک نگلی۔ زندگی کتنی جھلی۔ کتنی بے کار اور کتنی پیاسی ہے، اس کی چھاتیوں میں ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا عکس ہے۔ ہوا میں لہراتا سیاہ ساڑھی کا پلو ناگ کا سر ہے۔ لڑکی نے اس کے ہاتھ سہلاتے ہوئے ساڑھی کو سینے پر ٹھیک سے جمانے کی کوشش کی۔ ریت پر کالا ناگ بل کھا رہا ہے۔ اس کے منہ سے سرسبز ڈالی جھانکی ہے۔ جس پر پھل لگا ہے۔ (مجھے بھوک لگی ہے۔)

لڑکی اس کی بے معنی نگاہوں میں معنی پا کر لرز سی گئی۔

"یہ دیکھئے نا۔ آپ کے پیروں میں چھوٹے چھوٹے کتنے ہی کیکڑے ہیں"

(اچھا تو یہ کیکڑے ہیں)

لڑکی نے پاس پڑی خشک ٹہنی اٹھائی اور کیکڑوں کو بھگا دیا۔ کیکڑے ساتھ والے بل میں گھس گئے۔ (یہ مجھے نوچنا چاہتے تھے؟)

"آپ یہاں تنہا ہی آئے ہیں یا آپ کے دوست وغیرہ"

تنہا ـــ آپ ـــ دوست ـــ ساتھ وغیرہ ؟ ـــ تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ

آوازوں کے جو مختلف نمونے تمہارے منہ سے نکل رہے ہیں۔ یہ کیا ہیں؟ ان کا میرے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ ـــ میرے سارے رشتے گم ہو گئے ہیں۔ میں کس جیب میں اپنا عکس دیکھوں؟ سڑک اور پٹڑی کے سنگم پر لہو ملا دودھ ہے سانپ کے منہ میں پھل ہے۔ اور پھل کے اندر زہر ـــ مجھے بھوک لگی ہے۔

لڑکی نے اسے سوچتے ہوئے دیکھا۔ "آپ ہوش میں آگئے ہیں۔ اب میں چلتی ہوں"

اس کا گوشت کئی جگہ سے پھڑکا۔ اور پھر تن گیا۔

"آپ کو یقین ہے کہ اب آپ کو کسی مدد کی ضرورت نہیں؟"

یہ، یہ آواز کیسی آرہی ہے؟ چرچخ چراخ، کھٹا کھٹ، ٹھکا ٹھک، چرچخ چراخ۔ یہ تو ابھی ابھی اس لڑکی نے کچھ کہا تھا۔ ـــ

وہ اٹھی، کالے ناگ کا سر ہوا میں جھوما۔ ا ـــ ا ـــ آ سانپ مسکایا۔ لڑکی نے اسے اٹھانے کے لئے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اپنے اکڑے ہوئے ہاتھ سے لڑکی کا ہاتھ پکڑا ـــ یہ ـــ یہ لوہے کا ٹکڑا کہاں سے آ گیا۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور لڑکی کی طرف دیکھا۔ چرچخ چراخ، چرچخ چراخ، خزار پور کے دانت ـــ اور ان میں چمکتا ہوا ڈبل ایکل۔ یکدم اس کا جسم کانپنے لگا۔ اور اس کی آنکھیں ماتھے کے پیچھے چلی گئیں۔ سانس کے پیٹ میں خلا بھر کے اس کے وجود پر چھا گیا۔ تم کہاں ہو؟ ـــ میرے اندر بھونچال آگیا ہے ـــ یہ دورے میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے۔ میرے دالان کی کینچلی اتار دو ـــ تم کہاں چلی گئیں ـــ میں سمندر کی تہہ میں جا کر سیپ کا

کا منہ کھولنا چاہتا ہوں، اس نے اپنی آنکھیں مل کر سامنے دیکھا ــــ لوہے کے بازو اس کو اٹھانے کے لیے اس کی طرف بڑھے تھے، شیشے کی گول گول چمکتی آنکھیں۔ تمام جسم جامد۔ میں نے تو نرم نرم ہاتھ چھوئے تھے۔ یہ پسٹن کہاں سے آگئے۔؟ مشینوں کی آوازیں پہلے آتی تھیں۔ وہ لڑکی کہاں گئی، اوہ، ہاں، یہ اس کا گریبان ہے۔ اس کی آنکھیں گریبان کی بھول بھلیاں سے ٹکرا گئیں نظروں نے محسوس کیا۔ سفید سفید، نرم نرم دودھیا چھاتیاں۔ باقی سارا جسم سرمئی سرد۔ لوہا اس کے سر میں سمندر کی لہر آکے ٹوٹی۔ اس نے خاردار زبان اپنے خشک ہونٹوں پر پھیری۔ اس کے کانوں میں لاتعداد کارخانے چل رہے تھے۔ اس نے اپنی کلائی کے آگے لگے پنجے کو گریبان کی طرف بڑھتے دیکھا۔

"چیخ۔

لوہے کے پیلے آپس میں ٹکرائے۔ نرم نرم گوشت کہاں گیا؟ اس نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا۔ یہ آج میرے ہاتھ کو کیا ہوا؟ ــ میں نے تو اس کی خواہش نہیں کی تھی۔ پھر یہ اکڑا ہوا پنجہ!!) اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے سامنے گھورا۔

"پاگل"

اس نے فوراً بڑھ کر پاس سے گزرتے ہوئے سیاہ کپڑے کو پنجے میں پھنسا لیا۔ ساڑھی کا پلو پھٹ گیا، اس کے ہاتھ میں لوہے کا سینڈل تھا۔ تو یہ ناگ کا سر نہیں؟! ــــ میری کینچلی کا شکنجہ اور بھی کسا گیا ہے۔

اس نے پیر کو بے بسی سے بڑے غصے میں زمین پر دے مارا اور گھٹنوں

پہ گر کر جنون میں اپنی اکڑی ہوئی انگلیوں سے گیلی زمین میں گڑھا کھودنے لگا۔
دیوانہ وار۔ ——

رفتہ رفتہ اس کے تنے ہوئے ریشے تھکاوٹ میں رچ گئے۔ وہ ہانپتا ہوا گڑھے میں جا پڑا۔ اس نے اپنی آنکھوں پہ پڑے تھکاوٹ کے غلاف کی اوٹ سے دیکھا کر سمندر کے سانس منہ سے نکلتی جھاگ میں ٹوٹ رہے ہیں اور چٹان کے بل سے کئی کیکڑے نکل کر بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اس نے کروٹ بدل کر گڑھے کے آغوش میں منہ چھپا لیا اور پوری قوت سے آنکھیں بھینچ لیں۔

صدائے صحرا

ان دی مڈل آف دی سٹی واز دی ڈیزرٹ

ایلیو تُوریجا

"تاریکی کے عین وسط میں تاریکی تھی"

دو جمع چار چھ، اور منفی ایک سات

ہم بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔

وہ کونے میں بیٹھا دھوئیں کی سی تھا جو خلاؤں میں نابود تھا ؟
وہ اپنی ہتھیلیوں پر ٹھوڑیاں جمائے سوچ رہے تھے اور ہم جمع
چار کے ہاتھوں سے ان کی سوچ پھسل پھسل جاتی تھی۔ پیادے ٹھہرے
رخ قلعے، وزیر، بادشاہوں کی ڈھال بنے۔ وہ سب احکام کے
منتظر تھے۔

ہوں، اگر گھوڑا ڈھائی گھر چل کر بادشاہ کو شہہ دے تو رُخ کے
ہاتھوں [illegible] پیچھے ہٹ کر [illegible]۔
گھوڑا مر گیا۔ پیادہ آگے کرو ـــ "چلو سرکار" ـــ
"بادشاہ کا حکم"
ہم تو مطیع ہیں۔ دونوں نے سوچا
"بادشاہ تو گونگا ہے"
ہم ہنس دیئے
"جب چاند چھپا اور سورج نکلا نور روشنیوں کی جگہ شہر نے
ل اور تاریکی کی جگہ صحرا نے۔"
منفی ایک ابھی دھوئیں کی رسی تھامے نابود تھا۔ ہم نے سگریٹ
سلگا لئے۔ گھوڑا رخ کے ہاتھوں مارا گیا۔ رُخ کو فیل کھا گیا اور فیل کو
سیدھی چال چل چل کے پیادے کٹ کٹ کے ڈبے
میں گر رہے تھے۔ گھمسان کا رن پڑا ـــ ہمارے رونگٹے کھڑے
ہو گئے۔ ـــ اتنی خونریزی۔ ـــ
"تم تو چابکیہ ہو" جمع ایک کو جب کچھ نہ سوجھا تو اس نے کہا۔
"وہ کون تھا؟ ـــ اس نے کیا کیا تھا؟"
جو اس کھیل میں ہو رہا ہے۔
مہرے کٹ کٹ کے ڈبے میں گر رہے تھے۔ بساط پر انتشار تھا
ہم شور مچا رہے تھے۔

شہر کے عین وسط میں صحرا تھا۔"

بادشاہ سلامت، بادشاہ بچے —— ہم نے تالیاں بجائیں۔

بادشاہ آگے سامنے تھے۔

"بہت بڑا صحرا؟"

"ہاں —— اتنا —— بڑا —— چھپکلیاں —— گوہیں —— گدھ ڈھانچے —— !"

سچ مچ کا ویرانہ —— شہر کے عین درمیان۔"

"اور وہاں —— ایک عورت کا ڈھانچہ بھی تھا، اس کے پیروں میں بیڑیاں تھیں۔"

"تم نے کیسے جانا کہ وہ عورت تھی۔"

منفی ایک کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ "میں نے اس کی چھاتیوں سے دودھ پیا تھا۔"

ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"اوہ گڈ —— تو سچ مچ کا صحرا —— تم وہاں کیسے پہنچے تھے۔"

لہو کے دریا میں تیر کے

منفی ایک نوجوان کے چہرے پر جھریاں چھا گئیں۔ وہ سر کو ہاتھوں کے شکنجے میں کس کر بساط کے کنارے بیٹھ گیا۔ وہ دونوں کہ جن میں چار جمع ہو تو چھ بنتے تھے اپنی جگہوں پر تھم گئے۔ انہوں نے اسے شک کی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اپنا منہ نیچے کئے بڑ بڑا رہا تھا

"سائیں سائیں کرتے گھر — بیخ منخ درخت، فیکٹریوں اور فصلوں کے ڈھانچے۔"

"تم کس صحرا کی بات کر رہے ہو؟ — اس کی؟ — ہم جمع چار میں سے ایک نے اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"زمین کا دل ایک ہی ہے۔"

منفی ایک کے سینے کا زخم منہ میں آگیا اور ہمارے پیروں میں شہر کا نقشہ کھنچ گیا۔ ہم بساط چھوڑ کر شہر پر جھک گئے۔

"کتنا خوبصورت صحرا ہے۔"

جمع دو نے مانگے کا سگریٹ سلگایا۔ "ہمارے پاس بھی ایک صحرا ہے۔ سرسبز و شاداب جنگل کے وسط میں۔ اس کے گرد دیوار ہے — نہیں گرد نہیں — آدھا دیوار کے اندر اور آدھا باہر۔" —

"وہ مارا"

جمع دو کی بات پر کسی نے غور نہ کیا۔ ہم تیزی سے پلٹ کر پھر بساط پر آگئے۔ وہاں بادشاہ تھا نہ وزیر، خلا تھا۔ یہ کیا ہوا۔ یہ کیا ہوا۔

"میں اس دیوار میں ڈائنامیٹ لگا آیا تھا۔"

"شکر ہے ہم بچ گئے۔"

"ہم بچ گئے۔ ہم بچ گئے۔؟"

"یہ کھیل کی ازلی شکست ہے۔" منفی ایک نے سر اٹھایا۔

"ہوا ہو کہ میں آکر پھانسی پر چڑھ گئی۔

"وہ دونوں کھلاڑی کہاں گئے۔ ؟" ہم ہیں سے جانے کس نے پوچھا۔

"تم سنتے نہیں ہیں کیا بک رہا ہوں"۔ وہ کونے سے چیخا۔

ہم چونکے، منفی ایک کی طرف دیکھا کئے۔ ہم سمجھے وہ نابود تھا۔

بادشاہ بچے، بادشاہ بچے۔ بادشاہ کے سر پہ تاج نہیں پر بادشاہ ہے۔ ہم نے پھر بساط پر سر جھکا دیئے۔

"تم نے سنا نہیں ہیں کیا بک رہا ہوں۔"

"تم کیا بک رہے ہو۔"

"میں تاریخ کی کاربن کاپی چاٹ رہا ہوں۔"

ہمیں بے اختیار ہنسی آگئی۔ "تو چاٹتے جاؤ—— چلو جی تم یہاں چلو—— اور——"

اور چانکیہ یہ آج کی ڈکٹیشن ہے۔

"شہر کے دروازوں سے ہوا داخل ہوتی تھی، گلیوں، بازاروں میں پھرتی تھی۔ اور چوک میں آکر پھانسی پر چڑھ جاتی تھی۔"

نہ چاہنے کے باوجود ہمارے کانوں نے الفاظ وصول کئے۔ اور دماغ تک پہنچا دیئے۔ ہم نے ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور دھوئیں کی ڈوری کا سرا ڈھونڈنے لگے۔

"کیا کہا تم نے پھانسی پہ چڑھ جاتی تھی۔ ؟"

"ہوا ؟"

"ہاں۔"

ہم بے اختیار ہنسے ——— بیوقوف ——

نہیں شطرنج کھیلنے دو ——— میاں اتنا سوچو نہیں، ورنہ میدان خالی کر دو۔

کس کے لئے؟

ہمارے حلق میں ہنسی کہیں اٹک رہ گئی۔ "شہر کے عین وسط میں صحرا تھا۔"

"صحرا تھا؟"

"ہاں" ——— وہ دھوئیں کی ڈوری تھامے اٹھا، آہستہ آہستہ چلتا ہمارے پاس آگیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ وہ نہیں تھا۔ اس نے کش لے کر انگلی سے تمباکو کا ذرہ زبان سے ہٹایا۔ اس کی زبان پر تارکول کی کاربن کاپی کی سیاہی تھی۔ ——— ہم سہم گئے۔

"دیکھو" ——— اس نے بساط کو غور سے دیکھا۔ بادشاہ آمنے سامنے تھے۔ بساط لاشوں سے پر تھا۔

چالیں چلیے۔

"عین وسط میں صحرا تھا؟"

جھاڑیاں، ریت ہی ریت۔ ذروں سے کٹی زبانیں چمکتی تھیں۔"

"رات کو ———؟" ہم میں سے ایک نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"رات کو تارے نہیں نکلتے تھے۔" ——— وہ ہمیں خوفزدہ کرتے ہیں

کامیاب ہو رہا تھا۔
"اور گدھے ؟"
"ہاں گدھے بھی تھے۔"
کہاں گئے، کہاں گئے۔
صحراؤں میں صحرا ــــ خلاؤں میں خلا ــــ
منفی ایک پھیپھڑوں کی پوری قوت سے ہنسا ــ "یہ آج کی DICTATION ہے" ــ ہنستے ہنستے اس نے ڈبہ الٹا کر رکھ دیا۔ ایشیں دھڑا دھڑ زمین پر پھیلے شہر میں گریں۔
اس نے ڈبہ پیٹھ پیچھے چھپا لیا ــ چیخا ــ "تم نے اس ڈھانچے کی چھاتیاں چوسی ہیں ــ ؟" تم نے، تم نے تم نے ــ ؟"
ہماری آنکھوں میں سانپ کی آنکھیں تھیں۔ نہیں نہیں نہیں نہیں۔
صحرا کی اذیت
منفی ایک مسکرایا ــــ ہماری نظروں کو اپنی آنکھوں کے شکنجے میں کس کر اس نے پیٹھ پیچھے چھپایا ڈبہ نکالا۔
"تم سب ــ اپنی اپنی انگلی ــ اس ــ ڈبے ــ پر رکھو ــ"

ہم نے رکھ دیں ۔

اس نے ہماری انگلیوں سمیت ڈبہ سر پر رکھ لیا۔۔۔۔۔ ہم نے انگلیاں ہٹالیں۔

اس نے گھٹنوں تک جھک کر ہمارا شکریہ ادا کیا ۔۔۔ بساط ٹکڑے ٹکڑے کر دی ۔۔۔۔ اور بادشاہوں، وزیروں، قلعوں۔ ہاتھیوں، گھوڑوں اور پیادوں کو روند ڈالا۔ اس نے ہماری طرف ایک ایک کر کے دیکھا اور سینہ پھلا کر اطمینان کا سانس لیا ۔۔۔۔ اطمینان کا سانس ہوا میں تحلیل ہوتے ہی ہمارے ہاتھ اپنی گردنوں کی طرف اٹھ گئے ہمارے گلے میں دھوئیں کی رسّی تھی ۔۔۔ ہمارا سانس رُکنے لگا۔

ہوا ہوا ہوا۔

منّی ایک سکّے کے نتھنے زخموں میں چبھ رہے تھے ہوا سانس ہوا سانس ۔

جب ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ ہم اپنے گلے میں پڑی دھوئیں کی پھانسی کو کیسے کاٹیں ۔ تو ہم نے چوک میں سسکتی سسکتی ہوا کو تھاما، تیز کیا اور منّی ایک پر پل پڑے ۔

چنانچہ

ہم نے چاروں اور دیکھا۔

آج کا خوبصورت صحرا۔

ہم نے دھوئیں کی ڈوریاں اپنے اپنے گلوں سے اتار کے
تھام لیں اور صحرا میں نکل گئے۔
ہم چھائیوں والی کی تلاش میں ہیں۔

سب سے پرانی کہانی

تیز ہوا اور بارش اطوفان۔

رات بہت تاریک تھی، زمین اور آسمان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ایک سیاہ چادر تھی جو کہ آسمان بھی تھا اور زمین بھی۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی تو چادر پر پھڑ پھڑاتے ہوئے گیلے سیاہ درخت ذرا واضح ہو جاتے۔ وہ درختوں کے نیچے تاریک ہی رہتا۔ روشنی پھر چادر میں جذب ہو جاتی اور پھر اندھی دوات سے ٹپکتی ہوئی سیاہی اور اس کے گرد لپٹا ہوا سیاہ کفن۔

یہ بھی جیل ہے ... اس نے ہانپتے ہوئے درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائی اور کھٹی کھٹی آنکھوں سے اس تاریک قید خانے کا راستہ ٹٹولنے لگا۔ ابھی تو راستہ میرے سامنے تھا۔ پھر بجلی چمکی، وہ چار قدم اور بھاگا۔ راستہ کدھر ہے! وہ پھر رک گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، وہاں بھی سامنے کا عکس تھا۔ دائیں، بائیں، آگے، پیچھے۔ میں کدھر کو جا رہا تھا؟ یہ بجلی کیوں

نہیں چمکتی؟ — کہیں میں راستہ تو نہیں بھول گیا؟ — میں کس طرف کو جاؤں!
کہیں پھر سامنے جیل تو نہیں ہو گی۔ وہ کپکپا گیا — نہیں نہیں — میں جدھر
جا رہا تھا، ادھر دو دو درخت بالکل ساتھ اور ایک بالکل الگ تھلگ
تھا۔ بجلی کیوں نہیں چمکتی۔

اب تک جیل میں حاضری ہو چکی ہو گی اور الارم بج چکا ہو گا۔ لیکن مجھے اس جنگل میں کس طرح ڈھونڈھ سکتے ہیں۔ اس تیز بارش میں وہ میرے قدموں کے نشان کبھی نہیں پائیں گے۔ بجلی پھر چمکی۔ وہ اٹھ کر کھڑا بھی نہ ہو سکا۔ اس کی نظریں سامنے درختوں میں الجھ گئیں۔ سلاخیں ہی سلاخیں۔ میرا رخ غلط ہے۔ دو درخت بالکل ساتھ اور ایک بالکل الگ کس طرف نہیں ہے؟ اس نے اپنا رخ فوراً دوسری طرف کر لیا۔ مجھے کھڑا ہو جانا چاہیئے۔ تاکہ اگر بجلی چمکے تو فوراً بھاگ سکوں۔ اٹھتے اٹھتے وہ پھر لڑکھڑا کے بیٹھ گیا۔ میری ٹانگوں میں تو جان ہی نہیں۔ میں کس طرح بھاگوں گا۔ وہ تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر ٹانگیں دبانے لگا۔ اگر میں راتوں رات کسی محفوظ مقام پر نہ پہنچ سکا تو یہیں بیٹھے بیٹھے میرے گرد پھر جیل ہو گی۔ پولیس کو اطلاع ہو چکی ہو گی اور وہ جیپوں میں بیٹھے تیز روشنی میں مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ لیکن انہیں کیا پتہ میں کہاں ہوں۔ کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں جس سے — اس کا دل یکدم بیٹھ گیا۔ میں نے جیل والی قمیص اور سویٹر کہاں اتار پھینکے تھے؟ اگر راستے میں کہیں وہ چیزیں پولیس کے ہاتھ لگ گئیں تو پھر میں نہیں بچ سکتا۔ ممکن ہے انہوں نے وہ کپڑے اٹھا لئے ہوں اور سیٹیاں — دور سے موٹروں کی آوازیں اور قریب — بہت قریب — گڑ گڑ — آنکھوں سے روشنی چھین لینے والی روشنی — میرا کیا قصور ہے — میں نے کیا کیا ہے؟

تم —— ہا ہا ہا —— تم نے بھاگنے کی ناکام کوشش کی ہے ۔
قہقہے اور گرجے —— مجھے چھوڑ دو —— مجھے چھوڑ دو —— تم مجھے بلا وجہ قید نہیں کر سکتے —— ہاتھ گردن کی طرف —— ہا ہا ہا —— قہقہے پھر گرجے ، اپنا آپ چھڑاتے ہوئے ۔ اس کی دونوں کہنیاں تنے کے ساتھ ٹکرائیں بجلی جل کر بجھی —— بادل گرجا —— میں بھی کتنا بیوقوف ہوں —— وہ مسکرایا لیکن اب مجھے یہاں نہیں بیٹھنا چاہیئے ۔ وہ درخت کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا ۔ اس نے اپنے جسم کو ہاتھوں سے ٹٹولا —— میں ہوں —— اسے پہلی بار سردی محسوس ہوئی ۔ اس نے کپکپاتے ہوئے ایک ہاتھ سینے پر رکھا اور دوسرا پاجامہ نما نیکر کی جیب پر جس میں بٹن کی ٹوٹی ہوئی ملتی ۔ بیڑی اور ماچس پڑی تھی ۔ اگر میں نے یہاں کھڑے ہو کر روشنی کا اور انتظار کیا تو وقت بھاگتا ہوا مجھ سے آگے نکل جائے گا اور فاصلہ طے نہیں ہوگا ۔ درد میں ٹوٹتی ہوئی ٹانگیں اٹھتی اٹھتی رہ گئیں ۔ اگر میں غلط سمت میں چلا گیا تو ؟ —— جو ہوگا دیکھا جائے گا ۔ مجھے رکنا نہیں چاہیئے ۔ کیوں کہ میری دوڑ وقت کے ساتھ ہے ۔ اگر میں جیت گیا تو زندہ رہوں گا ۔ ورنہ وقت میرا سایہ بھی چھین لے گا ۔

بھاگو —— اور تیز —— بہت تیز —— اس کا ذہن اور ٹانگیں ایک دوسرے سے زیادہ تیز بھاگنے لگے ۔ کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی ، لیکن اب اسے اپنے راستے کے نشان کی کوئی پرواہ نہیں تھی ۔ وہ بھاگا جا رہا تھا ۔ اپنے دماغ سے تیز ، دماغ اس سے تیز ۔ تاریکی میں سلاخوں سے ٹکراتے ہوئے تیر جیسے وہ صدیوں سے اسی جنگل میں رہتا تھا ۔ زمین اس کے پیروں تلے سمٹ رہی تھی مگر فاصلہ طے نہیں ہو رہا تھا ۔ وہ وقت سے آگے نکل جاتا —— لیکن وقت کٹتا نہیں تھا —— میں کدھر جا رہا ہوں —— میں کس طرف نکل آیا ہوں ؟ یہ

کونسی جگہ ہے؟ ــــ اس نے بھاگتے بھاگتے تینوں طرف دیکھا - اتنی بارش
کہاں ہوتی ہے، اور وہ بھی کالا پانی ـــ یہ لمبے لمبے درخت، قطار در قطار
جو سرو ہیں نہ چیل نہ پیپل نہ بڑ ـــ لمبی لمبی سلاخیں ہیں ـــ جنگل ایسے
ہوتے ہیں؟ ـــ کہیں نہیں پھر ـــ نہیں، میں تو بھاگ رہا ہوں۔ اس شہر سے
اسی شہر میں، اس ملک سے، اسی ملک میں، اسی زمین سے، اسی زمین پر
بھاگ رہا ہوں۔ میری یہ دوڑ کب ختم ہوگی۔ وقت کب ختم ہوگا؟ مجھے بھاگتے
ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے ہیں، تب بھی رات تھی، اب بھی رات ہے، تب
بھی بارش اتنی ہی شدت سے ہو رہی تھی کہ اب، پانی تب بھی کالا تھا اور
اب بھی، یہ سب کچھ کیوں ختم نہیں ہوتا؟ کہیں کوئی گاؤں نہیں آتا، کوئی گھر نہیں
جہاں میں چولہے کے پاس بیٹھ کر ـــ آگ کا خیال آتے ہی، اس کے جسم میں سرد
لہر دوبارہ دوڑ گئی اور اس کے جسم پر گیلے بال بھی کھڑے ہو گئے۔ جہاں میں بیٹھ
کر گرم گرم چائے پینے کے بعد بیڑی سلگا لوں اور میری ساری تھکاوٹ
دھواں بن کر غائب ہو جائے۔ اس کی گرفت جیب پر اور بھی مضبوط ہو گئی۔
گرم گرم چائے کی ایک پیالی، اس نے لرزتے ہاتھوں سے پیالی پکڑ لی اور
اپنی آنکھوں کا سارا تشکر اس اجنبی بڑھیا کی آنکھوں میں انڈیل دیا۔ جس نے ایک
آدھ سوال کرنے کے بعد اسے تسلی دی تھی کہ اسے یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے!
ہاں جی! آپ فکر نہ کریں۔ تھوڑی سی تھکاوٹ دور ہوتے ہی میں یہاں سے
چلا جاؤں گا ـــ اسی بارش میں ـــ صبح تک میں شمالی سرحد پار کر
لوں گا۔ پھر مجھے کوئی خطرہ نہیں ہوگا ـــ جی بس ـــ ایک پیالی اور
بیٹی! ـــ میرے بوڑھے ہاتھوں میں طاقت نہیں ـــ تو ہی ان کی ٹانگیں دبا
دے، تاکہ یہ جلدی جا سکیں، وہ بہت شرمائی ہوئی! اس کے پاس زمین پر

بیٹھ گئی تھی اور ہولے ہولے اس کے پیر دبانے لگی تھی۔ اس نے اس لڑکی کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر بیڑی کا کش لگایا اور آنکھیں موند لیں۔ میں نئی دنیا میں آگیا ہوں ——— ٹھک ٹھک ٹھک ——— اس نے فوراً لڑکی کے ہاتھوں سے ٹانگیں چھڑا لیں ——— اچھی بڑھیا گھبرائی ہوئی آئی۔ بیٹی انہیں توڑی والی کوٹھری میں توڑی کے اندر چھپا دو ——— ان لوگوں کو میں خود ہی سنبھال لوں گی ——— اٹھو اٹھو جلدی کرو ——— لڑکی نے بڑی اداس آنکھوں سے دیکھا اگر تم پکڑے گئے تو میں ——— تو میں ——— وہ اٹھ کھڑا ہوا، میں تمہیں کبھی بھول نہ سکوں گا ——— ٹھنتے ——— دروازہ ٹوٹ گیا ——— میں تمہارے شہر میں نہیں ——— وہ پیچھے ہٹا ——— مجھے چھوڑ دو ——— میں تو اس زمین پر ہوں، جس کا کوئی نام نہیں ——— شمالی سرحد کے پار ——— وہ اور پیچھے ہٹا ——— تم مجھے نہیں پکڑ سکتے ——— پہلے ——— پہلے ان سے ——— اس نے ادھر ادھر دیکھا ——— وہ ایک قدم اور پیچھے ہٹا۔ اس کا پیر زمین پر جھاڑیوں میں الجھ گیا اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر جا پڑا بڑے زور کا دھماکا ہوا اور ساری دنیا روشن ہو گئی ——— اس نے سر اٹھا کے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا ——— وہ سامنے ——— وہ سامنے ایک مکان، اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ جنگل میں؟ ——— ہاں ——— اچھی بڑھیا کا گھر، اس کی بیٹی کا گھر ——— زندگی ——— وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا میں صبح تک شمالی سرحد ضرور پار کر لوں گا۔

وہ مکان کے سامنے تھا۔ کافی دور ہٹ کر جلتا ہوا درخت بجھ رہا تھا جس پر بجلی گری تھی، گھر میں کوئی روشنی نہ تھی۔

کوئی ہے ——— ؟ بارش کے شور میں اسے خود اپنی آواز سنائی نہ دی۔ اس

دروازہ کھٹکھٹایا۔

کوئی جواب نہیں۔

ساتھ والی دیوار میں کھڑکی کے پٹ زور سے بجے ۔ ۔ ۔ وہ لپک کر وہاں پہنچا۔ کھڑکی کا ایک پٹ جس کا ایک قبضہ ٹوٹا ہوا تھا، پھٹے ہوئے بادبان کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔

"گھر میں کوئی ہے"، اس نے کھڑکی کے اندر سے جھانک کر پوچھا

دھڑام   گھر کی خستہ چھت یا دیوار نے جواب دیا، مگر چیخ بلند نہ ہوئی

وہ کھڑکی کو پھاند کر اندر آ گیا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نیکر کی جیب سے ٹوپی نکالی، ٹوپی کچھ گیلی تھی۔ مجھے آگ کی بہت ضرورت ہے کہیں ماچس بھی گیلی نہ ہو گئی ہو۔ اس نے جلدی سے ماچس اور بیڑی نکال لیں اور منہ کی بھاپ سے ڈبیا کو کچھ خشک کیا۔ کئی مرتبہ دیا سلائی رگڑنے کے بعد سلائی جل گئی۔ اس نے کمرے کا جائزہ لینے کے بجائے اس شعلے سے ماچس کو اور خشک کیا۔ پھر اس نے کھڑکی بند کر کے اینٹ آگے رکھ دی اور دیا سلائی کی روشنی میں کمرے دیکھنے لگا۔ پچھلے کمرے کی دیواریں گری ہوئی تھیں اور آدھی چھت بھی زمین پر پڑی تھی۔ باقی دونوں کمروں کی دیواریں کونوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مکڑی کے جالوں سے بندھی تھیں۔ اس نے واپس اسی کمرے میں آ کے سوچا اگر یہ چھت گر بھی گئی تو   تو کیا ہوا، واپس جانے سے بہتر ہے کہ یہیں دفن ہو جاؤں۔ اس نے فرش پر بکھرے ہوئے ناریل کے بال اکٹھے کیے جو غالباً صوفوں میں بھرتے وقت رہ گئے تھے یا پھر صوفوں سے نکلے ہوئے تھے۔ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی اور ایک چھوٹے سے کمرے میں جو کہ غالباً باورچی خانہ تھا، چند ایک لکڑیوں کے علاوہ اور کہیں

کچھ نہیں تھا۔ اس نے یہ سب کچھ اسی کمرے کے ٹوٹتے ہوئے آتشدان کے قریب جمع کر لیا اور آتشدان میں آگ جلا لی۔

دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اس نے بیڑی سلگائی اور آنکھیں موند لیں۔

رات، بارش، ہوا اور بجلی ابھی تک ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے۔

اب میں بالکل محفوظ ہوں وہ مسکرایا۔ اس طرح زندہ رہا جاتا ہے۔ لیکن جانے شمالی سرحد ابھی کتنی دور ہے اور مجھے ابھی اور کتنا چلنا ہوگا۔ راتوں رات یہ سفر ختم ہو جاتا، تو اچھا تھا۔ دن میں سورج سے کیسے چھپ سکوں گا ــــــــ

مجھے چلنا ہی چاہیئے۔ اس نے کھڑا ہونے کی کوشش کی، ہاں، ورنہ پھر ڈیوڑھی میں دروازے کے پٹ زور سے بجے۔ اس نے گھبرا کے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک سایہ لپکا، وہ دبے پاؤں ڈیوڑھی کی طرف آیا۔ سایہ دیوار پر چلتا ہوا ڈیوڑھی کی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔

"کون ہے؟" ــــ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

کوئی بھی تو نہیں وہ تو آگ کی وجہ سے میرا اپنا ہی سایہ تھا۔ یہ دروازہ کھلا تھا؟ ــــ ہوں! ــــ دوسرا پٹ کھلا ہی ہوگا۔ اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ کمرے میں لوٹتے ہوئے اس کے پیر دہلیز میں جم گئے۔

وہ دبے پاؤں فوراً دہلیز کی اوٹ میں ہو گیا۔ آگ کے پاس کوئی بیٹھا تھا۔ سر جھکائے شعلوں کو گھور رہا تھا ــــ یہ کون ہے؟ ــــ کہاں سے آیا ہے؟ وہ یہاں پہلے سے موجود تھا یا اب [illegible]۔ کہیں مجھے پکڑنے والوں میں سے

تو نہیں ؟ —— اس کا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے وردی تو نہیں پہن رکھی۔ اس کے کپڑے اتنے گیلے ہیں کہ پانی سے بنے معلوم ہوتے ہیں اور شکل —— شکل ——اس نے آنکھیں جھپکا کر پھر اس کے چہرے کو دیکھا چہرہ واضح نہیں تھا۔ وہ ابھی تک اسی طرح بے حس چپ چاپ بیٹھا تھا۔ میں کب تک یہاں کھڑا ٹھٹھرتا رہوں گا۔ میں نے آگ اس کے لیے نہیں جلائی تھی۔ ممکن ہے وہ یہیں رہتا ہو۔ لیکن اس نے میری دستک کا کوئی جواب کیوں نہیں دیا تھا۔ شاید یہ بھی میری طرح —— جو کوئی بھی ہو۔ اگر اس نے کوئی ایسی ویسی بات کی تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔ میں اس سے کہیں زیادہ طاقتور ہوں۔ وہ چوکنا ہو کر دبے پاؤں چلتا ہوا بالکل اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے نے بالکل کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے دوسرے کی نظریں بچا کر زمین سے کرسی کا ٹوٹا ہوا بازو اٹھا لیا۔

"تم کون ہو؟" —— اس نے دوسرے کے نقش واضح دیکھنے کی کوشش کی۔

"جواب کیوں نہیں دیتے؟"

دوسرے نے جھکا ہوا سر دھیرے دھیرے اٹھایا اور نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اس کے جسم میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ دوسرے کی آنکھیں ناک گال، منہ اور کان ایک دوسرے میں گھلتے ملتے ابھر رہے تھے۔ بارش میں پڑی ہوئی رنگوں کی تصویر —— کرسی کے بازو پر اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی دوسرے نے نظریں دوبارہ جھکا لیں۔

"نہیں سنائی نہیں دیتا۔ کون ہو تم ـــــ؟"

"تم کون ہو؟" دوسرے نے جھنجھلا کر آگ سے کہا۔

تو یہ ان میں سے نہیں ہے۔ یہ مجھے جانتا ہی نہیں، ورنہ میں اب تک محصور ہو کر پکڑا گیا ہوتا۔ "میں اس جنگل کے رہنے والوں میں سے ایک ہوں" اس نے پہلے دھیرے ہو کر کہا۔ دوسرا مسکرایا۔

"اور تم؟" ـــ اس نے دوسرے سے کہا۔

"میں کوئی نہیں۔"

"کیا مطلب"؟

"میں سب کچھ ہوں۔"

"دیوانے ہو ـــ اب یہ مسکرایا ـــ "لیکن یہاں کیا کر رہے ہو؟"

دوسرا پھر سوچ کی آگ میں اتر گیا

"بتاؤ تا"

دوسرے نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "پتہ نہیں"

"ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ ورنہ میں تمہیں بھی قتل کر دوں گا۔"

"تو تم قاتل ہو" دوسرے نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ اس نے لکڑی ہوا میں اچھالی جیسے ابھی اس کے سر پر دے مارے گا۔ "تو پھر تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں"

"کیوں" ـــــ؟

"یہ ہاتھ والی لکڑی آگ میں ڈال دو۔ آنچ ہلکی ہو رہی ہے"۔

"تم بھی معذور ہو۔"

"تمہارا چہرہ واضح کیوں نہیں"

"تمہاری نظر کمزور ہے"

"میں ہر چیز کو صاف دیکھ رہا ہوں"

"یہ بھی نظر کا دھوکا ہے۔ تم آئینہ دیکھو گے تو اپنے آپ کو بھی پہچان نہ پاؤ گے"

وہ جھینپ سا گیا۔ "میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ تم مجھے صاف نہ دکھائی دے رہے ہو۔"

دوسرا ہنسا "یہ بھی فریب نظر ہے۔"

عجیب سی باتیں کر رہا ہے۔ کہیں یہ مجھے اپنی اس قسم کی بے معنی باتوں میں تو نہیں لگائے رکھنا چاہتا ہے تاکہ پولیس کے آنے تک میں کچھ سوچ نہ سکوں اور پھر یکایک ——— تم پولیس سے تو نہیں ہو؟"

"اوہنوں۔ مجھ پر تو خود مقدمہ چل رہا ہے۔"

مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ میں تمہیں زندہ نہ چھوڑونگا"

"میں تو خود کسی چال کا شکار ہوں۔"

"ثبوت؟"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم معذور نہیں ہو۔؟"

"میری نیکر"

"اس قسم کا کپڑا اور کہیں نہیں ملتا؟"

پر جھینپ گیا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ کہ یہ اس کے چہرے کے تاثر اور اس کی زبان پر اعتبار کرے۔ پھر اس نے سوچا کہ میں یہاں سے چلا ہی کیوں نہ جاؤں ـــــ یہ اٹھنے لگا۔

"جا رہے ہو؟"

"ہاں۔"

بارش اسی طرح ہو رہی ہے اور اب تمہیں اس قسم کی ابھر کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی۔

"تمہیں کس طرح پتہ ہے؟"

"ہوا کہاں نہیں جاتی" ـــــ وہ مسکرایا۔ میں نے اپنے آپ کو جنگل میں پایا ہے۔ حیرت ہے، تم سے آج تک ملاقات نہیں ہوئی۔"

"شاید اس لئے کہ میں گوشہ نشیں ہوں۔"

"پھر صبح ہو جائے گی، میں چلتا ہوں۔"

"لیکن اس جنگل میں تو تاریکی ہی رہے گی ـــــ اب ہمارا ساتھ شاید کبھی نہ چھوٹے۔ جہاں تم جاؤ گے میں بھی وہیں جاؤں گا۔"

"لیکن تم پر تو مقدمہ چل رہا ہے۔"

"جانے مقدمہ چل رہا ہے یا سزا بھگت رہا ہوں۔"

"تمہارا جرم کیا تھا؟"

"میرا؟" اس نے دیوار کے ساتھ پھر سے ٹیک لگائی۔

"اچھا اب چپ کرو اور مجھے سوچنے دو۔" دوسرا پھر آگ میں اتر گیا۔

"میں نے زندہ رہنے کی کوشش کی تھی۔" اس نے آنکھیں موند لیں،

"کون نہیں کرتا۔ ہر جو ایک مرتبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ زندگی اس کا حق ہے۔"

"ہم جس لمحے پیدا ہوئے ہیں۔ اسی لمحے مرنا شروع ہو جاتے ہیں۔"

"اور انسان اس عمل کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ بات بڑی معمولی سی تھی ——— میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ مجھے یہاں سے نفرت ہو گئی تھی (اور اب بھی ہے) اور میں یہاں چلا جانا چاہتا تھا۔ یہاں میں دن بھر سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا۔ میری کوئی قدر نہیں تھی۔ میرا دل پرواز کرلے کو چاہتا تھا۔ لیکن زمین کی دھول میرے پیر نہیں چھوڑتی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میرا بھی ایک اپنا گھر ہو۔ لیکن میں چچا کے گھر ایک کا یک میں قید تھا۔ بس ——— میں اپنا گھر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ جانے میرا گھر کیسا تھا۔ کہاں تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ——— میرے کانوں میں صرف ایک سریلی دھن کی لیس گھلی تھی اور میں وہاں نہیں تھا ——— جانے میں نے کیا کیا تھا کہ مجھے آگ کے شعلے بھڑکے۔

مجھے یہاں کے ہر فرد سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس نے دوسری لکڑی اٹھا کر زمین پر ماری۔ اور زمین پر کوڑے کی طرح نشان پڑ گیا۔ ہر جگہ یہاں سے بہتر ہو گی۔ یہاں میں نے چیخ چیخ کر سب سے کہا تھا۔ کہ دیکھو میں ہوں۔ اور سب نے یہی کہا تھا کہ تم نہیں ہو۔ میں نے یقین دلایا تھا کہ میری ماں نے جنم دیا تھا۔ اور سب ہنستے تھے۔ میں نے کہا کہ میرا باپ تھا اور سب نے زور زور سے قہقہے لگائے تھے ——— اور تم تم میرے چچا ہو۔ سب سے اونچا قہقہہ

اسی کا تھا ــــ ہاں اور میں تمہارا ان داتا ہوں۔ تمہاری ماں کا بھی ان داتا تھا"
اچکے کہیں کے ــــ میری ماں اسی دکھ میں مر گئی تھی۔ اسے شاید مر ہی جانا
چاہیئے تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اس کے بغیر زندہ رہ سکوں گا۔ مجھے ماں سے
بہت محبت تھی۔

آگ ہنسی ــــ ہاں ــــ اور وہ ہنسی ــــ پہلے سب تاریکی ہے لیکن
یہ کچھ مانوس نہیں۔ اس اندھیرے میں اپنی ہی روشنی تھی۔ اور میں نے کوئی
جرم کیا تھا؟ ــــ شاید اس اندھیرے کی لَو اونچی کرنا چاہی تھی، دھن
کی لِپس کا اثر ہو جانے دیا تھا ــــ ..ں نے کیا کیا تھا۔ مجھ سے کونسی خطا سرزد
ہوئی تھی ــــ مجھے اپنی ماں سے نفرت ہے..

مجھے پیسے چاہیئیں ــــ میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ پیسہ ابا ہا ہا۔
کہاں سے لو گے؟ ــــ یہیں کیوں نہیں کچھ کماتے ــــ یہاں کچھ نہیں ــــ
مزدوری کرو ــــ وہ تو میں کر ہی رہا ہوں ــــ مجھے روٹی کے علاوہ سب
کچھ چاہیئے۔ جو تمہارے پاس ہے، دوسری چیزوں پر میرا حق بھی ہے۔
کیوں کہ میں بھی تمہاری طرح ہوں۔ مجھے بھی موقع دو مجھے بھی زندہ
رہنے دو۔ پیسے دو گے یا نہیں؟ چچا نے دکان سے لوٹتے ہی مجھے بڑی
غلیظ گالیاں دی تھیں۔ میں اس سے رقم والی تھیلی چھین رہا تھا۔ اس کے ہاتھ
میری گردن پر تھے ــــ زندگی میری ہے۔ میں نے تھیلی چھوڑ کر چاقو نکالا
اور اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ میرے سامنے تھیلی کے پاس زمین پر چچا تڑپ
رہا تھا۔ چیخ رہا تھا۔ میرے ... تھے اور خون بھری انگلیاں میرے

منہ میں تھیں۔ پھر مجھے پتہ نہیں ہے۔ کیا ہوا تھا۔ چچی اور اس کے بچے بھاگے بھاگے
آنے لگے تھے۔ میں تو تھیلی اٹھا کر اپنی ماں کی قبر پہ ایسے خدا حافظ کہنے جا رہا تھا۔
ماں ــــ مدھم ہوتے ہوئے شعلوں پہ کسی نے لکڑی رکھی۔ یہ کوکھ
نہیں ہے۔ قبر ہنسی۔ یہ کیا ہے۔ کوکھ سے پہلے کیا تھا۔ قبر کے بعد کیا ہے
میں یہاں پہ کیوں ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔

مجھے کچھ پتہ نہیں پھر کیا ہوا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ میں کسی عدالت
کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے۔ کہ کٹہرا لکڑی کا نہیں تھا۔
میرے ارد گرد ہڈیوں کا جنگلا تھا۔ اور میرے ارد گرد گدھ ہی گدھ تھے
سر جھکا کے۔ عجیب سی بابس فضا لگی تھی۔ دور کہیں سے جیسے افق سے آواز
آئی تھی۔ کہ میں نے جسے چاقو مارا تھا۔ چونکہ وہ بچ گیا ہے، اس لیے اور
میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر میرا قصور کیا ہے۔

میرا قصور ؟

یہ زمین مجھے یہاں سے نہیں جانے دے گی۔ میں بے بس سا ہو گیا تھا۔

"یہ زمین میری نہیں ہے"

اور میں دن رات یہ سوچتا تھا کہ اگر میرا کوئی قصور نہیں تو یہ سزا
کس لئے ـــــ؟ میں نے سب کی طرح زندگی اور اس سے متعلق
چیزیں مانگی تھیں۔ مجھے انکار کر دیا گیا۔ میں نے اپنی چیز چھیننے کی کوشش
کی تھی اور میں جیل میں تھا، دوسرے قیدی بھی شاید اسی طرح سوچتے ہوں گے
دن رات چار دیواری میں بند سر جھکائے۔ ماریں کھاتے۔ پتھر چباتے
چٹانوں کو کندھوں پہ اٹھا کر آسمان پر۔ آسمان سے پھر زمین پہ۔ وہی پتھر دوبارہ کندھوں

پر پھر آسمان پر اور پھر زمین پر ——— میں پتھر نہیں
چباؤں گا۔ چٹانیں نہیں اٹھاؤں گا۔ ان لوگوں کے دماغ سڑ گئے ہیں اور میرا
دماغ ابھی تازہ ہے۔ میں آزاد پیدا ہوا تھا اور آزاد ہی رہوں گا۔ میں میتوں کے
بستر پر نہیں لیٹوں گا ——— یہ جسم میرا ہے۔ میں اس کی حفاظت کروں
گا۔

جسم کہاں ہے؟ ——— آگ کی لپٹیں اور بھی اونچی ہو گئی تھیں۔ پھر رات آئی
بارش آئی۔ اور طوفان آیا اور میں اب بھی وہیں ہوں۔

میں وہاں نہیں ہوں

اور مجھے اب بھی پتہ نہیں چلا کہ میں نے کیا کیا ہے۔

ہوں، ——— وہاں سے نکل کر سب سے پہلے میں ماں کی قبر پر جانا چاہتا
تھا ——— لیکن وقت ———

ماں سے محبت ——— ؟

کیسے نہیں ہوتی۔

مجھے نفرت ہے۔ نہ وہ مجھے جنم دیتی اور نہ میں اس طرح سوال بنتا۔
میرا بس چلتا تو میں کوکھ ہی میں اسے مار دیتا۔

"کیا کیا ——— تم نے کیا کہا؟" ——— اس نے گھبرا کر دیوار سے آگے
کو جھک کر کہا۔ دوسرا اسی طرح آگ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"ہوں؟"

"تم نے کچھ کہا تھا؟"

"کچھ نہیں، میں نے تو کچھ نہیں کہا۔"

"ابھی ابھی"

"یہ کس نے کہا تھا ـــــ"

"کہ"

"خیر چھوڑو اسے ـــــ میں تو سوچ رہا ہوں کہ یہ کس قسم کا مقدمہ ہے۔ اگر سزا ہے تو کیسی ہے۔ اگر میں مجرم ہوں تو کیا الزام ہے۔ میں جہاں بھی ہوں یہاں کیوں ہوں ـــــ میں واپس جانا چاہتا ہوں ـــــ"

"کہاں؟"

"جہاں سے آیا ہوں"

"تم میرے ساتھ چلو شمالی سرحد کے پار۔"

"جب میں نے تمہارے ساتھ چلنے کو کہا تھا تو تم گھبرا گئے تھے۔"

وہ مسکرایا ـ "لیکن نہیں ـ میں یہاں سے نہیں ہوں۔ یہاں سے کوئی راستہ نہیں جاتا اور میں واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"تاکہ میں جا کر پتہ کروں کہ جہاں میں تھا، وہ کیا تھا، میں وہاں کیوں تھا۔ اور میں یہاں کیوں تھا۔؟"

"کس سے پوچھو گے؟"

"اپنے آپ سے"

"وہ واقعی پاگل ہے، کوئی مقدمہ وغیرہ نہیں ہے، کسی پاگل خانے

سے بھاگا ہوا ہے۔" "پر تم وہاں جاؤ گے کیسے؟"

"دیکھو، بارش ختم ہو گئی ہے؟"

اس نے اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ دور افق پر سویرے کی روشنی تھی، آسمان صاف تھا۔ اس نے لمبا سانس لیا۔ "تم تو کہتے تھے یہ جگہ تاریک ہی رہے گی۔"

"ہے تو ——— یہ روشنی جنگل سے دور ہی رہے گی۔" ———

پہلا ہنسا ——— "چلو چلیں" اس نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"سامنے پہاڑی ہے نا ——— یہی شمالی سرحد ہے۔"

"اچھا ——— پھر تو ہم بہت نزدیک ہیں۔"

"لیکن چٹان بالکل سیدھی ہے، قدم نہیں پڑ سکتا۔"

"میں انتظام کر لوں گا"

"اس پر کوئی جھاڑی یا درخت نہیں"

"میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔"

"اور مجھے تنہا چھوڑ کے چلے جاؤ گے ——— میں تمہیں جانے نہیں دوں گا"

دوسرا اکڑ گیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ——— پہلا کھڑکی سے گھوما ——— "تم نے خود ہی کہا تھا ——— نہیں نہیں تم اپنے راستے جاؤ۔"

دوسرا اتنے زور سے ہنسا کہ باقی کی چھتیں بھی گرتی گرتی رہ گئیں۔

"میرا راستہ کاٹھ کے دروازے سے ہو کر جاتا ہے" وہ اکھڑی طرح کھڑا ہو گیا۔ اور اس کی طرف بڑھنے لگا۔ جیسے کاٹھ کا دروازہ توڑ دینا چاہتا

ہو۔

"اگر یہی بات ہے تو میں تمہیں قتل —"

"میں مر نہیں سکتا" — دوسرا پھر ہنسا — "میرے کان نہیں آنکھیں نہیں — مجھے کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ اور میں یوں بول بھی نہیں سکتا۔ پہلے نے کچھ کہنا چاہا لیکن دوسرے نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "میرے راستے میں کاٹھ کا ایک دروازہ ہے، جب تک وہ سایہ نہیں بن جاتا۔ مجھے اپنے سوال کا جواب نہیں ملے گا — مجھے جواب چاہیئے — جلد بہت جلد —

دوسرا اسی طرح چیختا ہوا آگ میں جا کھڑا ہوا۔ آگ اور بھی بھڑکنے لگی۔ دوسرا ہنسا — بہت زور سے — اور زور سے — "دیکھو — میں تب تک چل نہیں سکتا، جب تک ہر چیز سایہ نہیں بن جاتی — میرے کپڑے تب تک گیلے ہی رہیں گے۔

"کو — کو — کون ہو تم —؟"

"ایک — جو اپنا جرم جاننا چاہتا ہے" — وہ آگ سے نکل کر اس کی طرف بڑھا۔ پہلا لنگڑے پاؤں چلتا ہوا گھبرا کے تیزی میں کھڑکی پھاند کے باہر آ گیا اور دیوار کے ساتھ پڑی اینٹ اٹھالی۔ اس نے کھڑکی سے اندر جھانکا کھڑکی کی اوٹ میں کھڑا ہو گا۔ پہلا اینٹ پکڑے بھاگنے لگا۔ شمالی سرحد کی جانب — میں نہیں مروں گا — میں اتنی مشکل سے آزاد ہوا ہوں۔"

"تم اب بھی قید ہو —" قریب ہی جیسے دوسرے کی آواز آئی —

اس کی اینٹ پر گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی اور یہ رک گیا۔ پہلے اس
سے نپٹ ہی لوں، پھر اطمینان سے پہاڑی پر چڑھوں گا — اس نے
ادھر ادھر دیکھا کوئی نہیں تھا — ابھی ابھی تو اس کی آواز آئی تھی —
کہاں ہو تم۔ —— ؟

تم کہاں ہو؟" دوسرے کی آواز بالکل اس کے کپڑوں کی طرح بھیگی ہوئی
تھی اس نے چاروں اور دیکھتے ہوئے سوچا۔ ابھی ابھی تو اس نے
میرے سامنے گھڑ کی بچھاندی تھی۔ مجھے جلد از جلد اس کاٹھ کے دروازے
کو ڈھونڈ لینا چاہئے۔

پہلے نے خود کو تھپا کے اینٹ پھینک دی اور چٹان پر چڑھنے لگا۔
آہ — شمالی سرحد — اب وہ کم بخت مجھے کبھی نہیں پکڑ سکے گا۔
ایک دو قدم چڑھنے کے بعد وہ پھر پھسل کے چٹان کے قدموں میں آگیا۔ پھر
چڑھنے لگا۔ پھر پھسلا۔ اس نے اینٹ اٹھالی۔ کہیں وہ پیچھے سے آ نہ لے۔
جانے کہاں ہے۔ —— ؟

کہاں چلے گئے ہو —— آؤ — میں دروازہ پار کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری
مشکل بھی حل ہو جائے گی۔" —— دوسرے نے دیوانوں کی طرح بھاگتے
ہوئے کہا —— پہلا اس کے بالکل آگے تھا —— کوئی نہ کوئی ایسی جگہ تو ہوگی
جہاں سے اس پہاڑی پر چڑھا جا سکے۔ وہ پاگلوں کی وادی میں چکر لگانے
لگا۔ کبھی دوسرا اس کے آگے ہو جاتا تھا، کبھی وہ دوسرے کے آگے۔

دو مجھے راستہ دو — کہاں ہے ؟"

وہ جانتے کمبخت کہاں ہے؟"

دونوں وادی کے دائرے میں ایک دوسرے کو ڈھونڈ رہے تھے ایک دوسرے کے آگے پیچھے، پیچھے آگے۔ —— دائرے میں دور دور نیچے چٹانوں کے گول دائرے میں دو سائے یا دو وجود یا ایک سایہ ایک وجود یا دونوں کچھ نہیں —— صرف ہوا —— صرف لو —— آسمان پر منڈلاتی ہوئی گدھوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

وادی کے عین اوپر، اپنی آنکھوں کے بالکل سامنے گدھوں کو منڈلاتے دیکھ کر وہ لرز گیا۔ اور یکدم پتھر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

گدھ، لاش —— اس نے سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر نیچے وادی میں نظر دوڑائی اور زمین پر پڑے کنکر کو وادی کے رخ ٹھوکر مار کے سوچا، یہ جگہ کچھ عجیب سی ہے۔ یہاں سیر کے لئے قطعی نہیں آنا چاہیئے۔

سازش

ہم دنیا جہان کی باتیں کرتے، سارا دن مٹی کی ڈگریاں اٹھا اٹھا کر گڑھوں میں ڈالتے رہے۔ ہم آزاد تھے، صرف ایک دوسرے کو دیکھ کر یاد آتا تھا کہ ہم قید میں ہیں۔

ہم چھوٹے سے ٹیلے پر سستانے کے لئے بیٹھے تھے۔ ہوں، ہم نے سوچا، ہم نہر کھود رہے ہیں۔

ہوں!

ہم سورج کی آخری کرن تھامے بند لاری میں بیٹھے لوٹ رہے تھے اور اپنے جسم پر بجا گئی ہوئی نیلی پیلی سلاخوں کو دیکھ رہے تھے۔

روشنیاں۔

روشنیوں کے سیلاب میں نوجوان لڑکیاں نظر آئیں۔ لاری کی رفتار کم

ہو گئی۔ ہم نوجوان مسکرائے۔ بوڑھا سنجیدہ ہو گیا۔ "تانگے میں پچھلی گدی پر بیٹھی
لڑکیوں نے اپنے سینوں پر گرم گرم چادریں سرکا دیں۔ بوڑھا مسکرایا۔ ہم نے
کہا — "لڑکیاں"

ایک نے کہا — "آہ — بمبئی — یہ سب سالا ہوچ پوچ ہے۔
وہاں اپنا کھولی یہاں کے شیش محل سے بہت اچھا تھا۔"

ہم نے سوچا۔ یہ ہنر مکمل کب ہو گی۔

"قیدی" تانگے کی پچھلی گدی پر ایک لڑکی نے دوسری سے کہا۔ ہم حیران رہ
گئے۔ لاری تانگے سے آگے بڑھی۔ تانگہ میلوں پیچھے رہ گیا۔ ہم پھر روشنی کی لکیروں کا
پیچھا کرنے لگے۔ ہم سب جانتے تھے کہ یہ لکیریں ہمیں کہاں لے جائیں گی — ہم
نے ساتھیوں سے دیکھا ایک نے کہا میرا شہر — دوسرے نے آنکھیں بند کر لیں "دلی چاندنی
چوک — امرتسر — نان قلچے، باقر خانیاں، ہال بازار، دربار صاحب۔"

"سکھ واپتر" بنسر نے مجھ سے بیڑی مانگ کر سلگائی۔ لاہور —
لاہور اسے۔ بھاٹی لوہاری، موچی۔"

بوڑھا مسکرایا — "تم کہاں تھے۔"

"میں ؟" — اس کی مونچھیں ننھی ننھی چھوٹی تھیں۔ "میں — ؟ میں کہاں
ہوں ؟"

ہم سب ہنس پڑے۔ وہ جھینپ گیا اور ہمیں بھی اپنے ساتھ لے
ڈوبا۔

"میں مونٹگمری میں تھا" بوڑھے ... نے کہا۔

ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ "موہنجوڈارو یہیں ہے؟"

"ہاں" — بوڑھے کے چہرے پر جھریاں اور بھی گہری ہو گئیں۔ آنکھوں میں بجھتی چمک بھڑکی۔

"لیکن وہ تو بہت قدیم زمانے کا شہر ہے۔"

"کیا میں قدیم نہیں ہوں؟"

!

"یہ وہی شہر ہے، جہاں سے وہ رقاصہ"

"ہاں۔"

"لیکن وہ تو معدوم ہو چکا ہے۔ ایک زمانے کی بات ہے۔"

"ہر شے معدوم ہو چکی ہے، ایک زمانے کی بات ہے۔ بوڑھے نے آنکھیں جھپکیں۔

ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور ہم نے سلاخیں تھام لیں۔

بوڑھا ہنسا — "وہ مشہور رقاصہ میری بیوی تھی۔ اس نے آہ بھری "میرا شہر"

ہم سب کو سانپ سونگھ گیا۔

پھر میرے قریب بیٹھا وہ لڑکا جس کی مونچھیں نئی نئی پھوٹ رہی تھیں یکلخت چیخا "جھوٹے تم سب جھوٹے ہو، ہم سب کھوئے ہوئے ہیں۔ ہم سب نہیں ملیں جھوٹے، مکار، بہروپیے" ... اس نے بوڑھے کو داڑھی سے پکڑ لیا۔

پھر سارا منظر ... لڑکے کی آنکھوں میں خون ابلا جھاگ بنا۔ ہم نے ایک

دوسرے سے پوچھا۔ بھلا یہ کیا بچگانہ حرکت تھی۔ جب پہرے دار لڑکے کو لے گئے تو ہم میں سے ایک نے سرگوشی کی۔

یہ اس مشہور رقاصہ کا حرامی بچہ ہے۔

ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی۔

ہم سارا سارا دن مٹی کی ٹوکریاں اٹھا اٹھا کر ٹرکوں میں ڈالتے رہتے ہیں ——

چپ چاپ :

ہم قیدی نہیں ہیں۔ صرف ایک دوسرے کو دیکھ کر یاد آتا ہے کہ ہم قید میں ہیں۔ ہمارے ہونٹوں پر خاموشی کی مہریں ہیں۔

ہم چھوٹے سے ٹیلے پر ستانے کے لئے بیٹھے ہیں۔

اٹھو۔ اٹھو۔ کام کرو۔ بھاگنے کی سوچ رہے ہو؟ —— سازشی ان میں سے ایک آکے غرایا ہے۔

ہماری چپ سازش ہے اور ہم سوچتے رہتے ہیں کہ یہ سازش کب مکمل ہوگی۔

دیوار اور دروازہ

دس بجنے میں پانچ منٹ!

اس نے دروازے کی اوٹ میں ہو کر سوچا —— ایک دفعہ اس دروازے سے باہر قدم رکھ لوں تو پھر آزاد ہو جاؤں گا —— لیکن ہسپتال کے پورچ میں بڑی تیز روشنی تھی اور چوکیدار ہاتھ میں چھڑی لئے ٹہل رہا تھا۔ پورچ سے ذرا آگے دھندلی سی دیوار تھی۔ میں اس دیوار کو کیسے پھاندوں گا۔ اس نے دروازے کی اوٹ سے ذرا سا سر نکال کے دیکھا۔ اس میں تو دور تک دروازہ نظر نہیں آتا۔ اس کمبخت وارڈ کے بیرے نے مجھے یہ بتایا ہی نہیں تھا کہ پورچ کے سامنے دیوار ہے۔ ایک روپیہ خواہ مخواہ حرام راستے گیا۔ اگر دیوار نہ بھی ہوتی تو میں اس روشنی کے جال سے بچ کر کیسے نکلتا۔ اس کی نگاہیں پھر دیوار کو ٹٹولنے لگیں۔ میری نظریں اس دیوار پر پھیل گئیں

رہا ہوں۔ یہ ــــ یہ تو وہی دیوار ہے ــــ وہی میرا سایہ ہے؟

پورچ میں گڑگڑاہٹ کی آواز آکر وہ روشن آنکھوں میں بجھی۔ چوکیدار ایمبولینس کے ڈرائیور کے ساتھ بڑھا۔ دیوار کا بندوبست بعد میں ہو جائے گا۔ پہلے میں یہاں سے تو نکلوں۔ وہ کچھ اور سوچے بغیر وہاں سے نکل آیا اور ایمبولینس کی آڑ لے کر دبے پاؤں پورچ سے نکل گیا۔

یہ دیوار کہاں گئی؟ اوہ ــ وہ سامنے ہے، اپنی جگہ سے کھسک گئی۔ یہ پہلے ہی کہاں تھی۔ وہ روشنی اور اندھیرے کے گھلتے ہوئے سرمئی تالاب میں کھڑا تھا۔ اس نے گھوم کر دیکھا، چوکیدار اور کالونی کے بیرے زخمی کو ایمبولینس سے نکال رہے تھے۔ اسے جھرجھری آگئی۔ اس نے منہ پھیر سامنے دیوار کی طرف کر لیا۔ مینٹیس وارڈ بیرے پر میں نے ایک روپیہ ضائع نہیں کیا۔ وہ مسکرایا۔ یہ دیوار تو میری آنکھوں میں ہے۔ اچھا اس نے مجھے بتایا تھا کہ اگر میں دائیں طرف کو گیا تو ممکن ہے پکڑا جاؤں اور اگر اس سامنے کی عمارت کے ساتھ ساتھ چل کر بائیں جانب مڑا تو میں گیٹ سے باہر نکل جاؤں گا۔

رات تاریک تھی۔ پورچ کی روشنی دالان میں کھڑکی کا روشن تک پہنچ کر دم توڑ دیتی تھی۔

کوئی بھی دیکھ تو نہیں رہا۔

نہیں۔

ڈیوٹی کے سپاہی کالونی میں زخمی کی رپورٹ لکھتے چلے گئے تھے۔ چوکیدار

[illegible]

نرسوں کے سایئے اپنے دوستوں سے جدا ہو کر جلدی جلدی ہوسٹل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ کافی دور گیٹ کا چوکیدار ایک کار روکے کھڑا تھا جو کہ باہر جانے کے راستے سے اندر آرہی تھی۔ بھلا یوں بھی کبھی ہوا ہے۔ وہ مسکرایا۔

اور تو کوئی نہیں، صرف کتوں کا راج ہے —— اسے اسے —
بھونکنا نہیں۔

کتے آپس میں بہت مصروف تھے۔

کہیں وہ چوکیدار اس کار والے کو اندر آنے کی اجازت نہ دے دے اور میں اس کار کی روشنی میں برہنہ ہو جاؤں گا۔ کار آہستہ آہستہ گیٹ سے اندر بڑھنے لگی۔ سرمئی تالاب میں کھڑے کھڑے اس کا سانس پھول گیا۔ وہ مجھے پکڑ کر لے جائیں گے۔ وہ۔ وہ دیوار —— ؟ ہاں وہ سامنے، لعنت ہے مجھے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ اور وہ اندھیرے میں بے تحاشا بھاگنے لگا اور سامنے دیوار تک پہنچتے اسے ہتھیلیاں بیٹھ گئیں اس نے ہانپتے ہوئے عمارت کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی۔ تو یہ وہ دیوار نہیں ہے۔ یہ تو اینٹوں کی دیوار ہے۔ اس نے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے دیوار کا جائزہ لیا۔ اس میں تو دروازے کھڑکیاں بھی ہیں، تو وہ دیوار نہیں ہو گی۔ میری آنکھوں کے سامنے جھلی آگئی ہو گی۔

وہ دیوار سے بیٹھ لگائے گھسٹتا ہوا چلنے لگا۔ پشت سے وہ بالکل محفوظ تھا۔ اگر کوئی اس کا پیچھا کرتا آئے گا۔ تو اس کے سامنے ہو گا۔

پھڑرررر

اس کا ہاتھ فوراً ہینڈل پر جا پڑا۔ اور وہ پیچھے گرتے گرتے بچا۔ دروازہ
اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ کونسی جگہ ہے۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں سیاہ ہو
گئی تھیں یا روشنی میں اندھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے
میں سرمئی تالاب کی تہہ میں پہنچ گیا ہوں یا ——— اس نے دروازہ کے ہینڈل
سے ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھیں ملیں۔ کئی روشن داغ مختلف سمتوں سے آ کر مرکز
میں ملے اور پگھل کر کولتار کا داغ نقطہ بنتا بنتا سیاہ غبار پھیل گیا۔

کسی اختلاف پر باہر کتے بھونکے۔ وہ بدک کر دروازے کے پیچھے ہو
گیا۔ دالان میں چند سائے تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ بھونکتے رہو سالو
اس نے دروازہ بند کر دیا اور کتوں کی آواز ڈوب گئی

کون ؟ ن، ن، ن، ن

تو گویا میں کسی بہت بڑے ہال میں آ گیا ہوں ۔

کسی کے ہاتھ نے جلتی ہوئی موم بتی بلند کی۔ " بولو ! کون ہو تم ؟ م م م
" میں ؟ — وہ شعلے کی طرف بڑھا ۔

میں ؟ میں ؟

موم بتی والے نے قریب ہی دیوار کی طرف دوسرا ہاتھ بڑھایا۔ ہال
روشن ہو گیا۔ کتنا سیاہ رنگ ہے اس کا۔ جبھی تو اندھیرے میں نظر نہیں
آیا۔ موم بتی کا شعلہ بھی سیاہ ہو گیا۔ اور اس کی آنکھ بھی تو ایک ہے۔ سائیکلوپس
پورے سے دس۔

اس کی نظریں سامنے دیوار پہ لگے کلاک سے اتر کے ہال میں گھومنے لگیں۔ ہال کے اس شروع سے لے کر اس شروع تک لوگ سفید چادریں تانے سو رہے تھے۔ یہ بھی ہسپتال ہے۔ وہ گھبراہٹ میں مڑا۔ لیکن یہ مریض تو پلنگوں کی بجائے میزوں پہ پڑے ہیں۔ پہلی مرتبہ میں مدتوں سے بسنے والی بو نے اس کے دماغ کو چیرا۔ یہ بو وارڈ کی بو سے مختلف ہے۔ سوں، سوں۔

پہلی میز کے قریب کھڑے تنہا آنکھ والے نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا "تم تو ہسپتال سے بھاگے ہوئے ہو۔"

ہال کی اونچی چھت کو فرش سے ملاتے ہوئے ستون، محرابیں، غٹرغوں غٹرغوں، روشندانوں میں کبوتر پھڑپھڑائے۔ یہ بو کیسی ہے؟ وہ ابھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ یہ خوشبو ہے یا بدبو۔ سوں سوں۔

ایک آنکھ والے نے اپنے موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں پہ پھیلی مسکراہٹ کو برقرار رکھتے ہوئے کہا "یہ فارمین کی بو ہے اور تم گونگے ہو؟"

اس نے غور سے اس کو دیکھا۔ تنہا آنکھ والے کی آنکھ ماتھے میں نہیں تھی "نہیں سائیکلوپس۔"

"تو پھر تم بولتے کیوں نہیں؟"

بلکہ اس کی دوسری آنکھ کی جگہ بالکل سپاٹ تھی۔

"میں اسٹول پہ بیٹھ جاؤں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "میں بہت تھکا ہوا ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ" ـــــ وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ "ہوں! اب تم وارڈ

سے کیوں بھاگے ؟ "

" وارڈ ؟ — اس نے بڑی معصومیت سے کہا ، میں تو کبھی ہسپتال میں داخل ہی نہیں ہوا ۔"

" جھوٹے ۔ تم نے ہسپتال کی وردی پہنی ہوئی ہے ۔"

" میں نے ؟ — اس نے اپنے لباس کو دیکھا ۔ نہیں ، — نہیں ۔ " نہیں تو "

" ہاہاہاہا — " وہ ہنستے ہنستے سٹول پر بیٹھ گیا ۔ " تم مجھے جھٹلا نہیں سکتے ۔ لمبی دھاریوں والا کرتہ اور پاجامہ — ہسپتال میں آ کر ہر ایک کو یہ لباس پہننا پڑتا ہے ۔

دھاریوں والا کرتہ اور پاجامہ ؟ — نہیں — یہ دھاریاں کہاں ہیں ، یہ تو سلاخیں ہیں ۔ اور میں قید میں ہوں ۔ " یہ لباس تو میں شروع سے پہنے ہوئے ہوں ۔ " —

" لباس تو یہی ہوتا ہے "

پھر سلاخیں یہاں آ کر ظاہر ہوتی ہوں گی ۔ پہلے اگر میں آزاد ہوا تھا ۔ قید ہوا تھا ؟ یہاں آنے سے پیشتر تو کوئی آزاد ہوتا ہے ۔ نہ قید — اور میں زندگی میں ہو لی — " نہیں ، میرا مطلب ہے شروع سے — ازل سے —

" میں نہیں سمجھا — بہرحال تم یہ بتاؤ کہ وہاں سے بھاگے کیوں ؟ "

" کیوں بھاگا ؟ — بڑی سیدھی سی بات ہے ، میں وہاں رہنا نہیں چاہتا ہوں گا ۔ "

—— یہاں کیوں آگئے۔

" کیوں آیا ہ محض اتفاق سمجھ لو —" اس نے اپنے کندھے جھٹکائے۔

" اور تم کون ہو ؟

" میں کون ہوں ! " میں کون ہوں ؟ "

ہال میں ہنسی کی بازگشت۔ " مجھے کیا پتہ ! پھڑ پھڑ پھڑک، غٹر غوں، غٹر غوں یہ مجھے جانتا ہے ؟ اس کے کہنے کے انداز سے تو یہی معلوم ہوتا ہے جیسے اسے سب پتہ ہو۔ یہ مجھے بتا سکتا ہے، کاش میں بتا سکتا میں کون ہوں —— میں بکھرے لمحوں کو کیسے جمع کروں، وہ تو راکھ ہو کر ہواؤں میں بکھر گئے۔ یہ مجھ سے کہے جا رہا ہے کہ میں ہسپتال سے آیا ہوں۔ لیکن مجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ نہ میں کہیں سے آیا ہوں اور نہ کہیں گیا ہوں۔ میں تو یہیں تھا اور یہیں ہوں۔ اگر میں کوئی تھا تو اسے ضرور پتہ ہوگا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تنہا آنکھ والے کے کندھوں کو تھام کر اس کی آنکھ میں التجا کرنا چاہی۔ لیکن جیسے اس کے کندھے تھامے ہی تھے اس کے ہاتھ اس کی گودی میں ہی لوٹ آئے۔

تنہا آنکھ اس کی آنکھوں کو نگلنے لگی۔ اس کو کپکپی آگئی۔ اس نے اپنی نگاہیں ہٹا کر یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ وہ میز کے ساتھ لگ کر اپنے ہاتھ سے کیا کر رہا ہے۔ لیکن اس کی آنکھ میں مقناطیس تھا۔ ایک آنکھ والے نے پلاسٹک کی چادر سے جھانکتا ہوا خشک ہاتھ بڑھا دیا۔ " —— ہوں۔ تو۔ "

ہوں تو کیا ؟ —— یہ مجھی سے سوالات کئے جا رہا ہے۔ میں بھی تو اس سے پوچھوں —— یہ کون ہے، یہ جگہ کون سی ہے۔ اور یہ پلاسٹک کی چادر

کے نیچے کون لوگ پڑے ہیں۔ اس کا دل ہال میں گونجنے لگا۔ میں اس سے پوچھوں؟ اس گونج کے لاتعداد آبشار اس کے دماغ میں گرنے لگے۔ اس نے اپنے ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔ —— یہ شور، یہ شور —— یہاں تو اتنی خاموشی تھی؟ اس کی آنکھیں ابھر آئیں۔ پتلیاں پھیل گئیں۔ ساری روشنی پسینے میں ڈوبے شیشوں پر بکھر گئی —— یہ شور —— یہ شور —— میں اندھا ہو گیا ہوں۔ وہ چیخا۔

"تم کہاں ہو ؟"

"تمہارے پاس —— کیوں کیا بات ہے ؟"

مجھے معاف کر دو —— معاف کر دو —— آئندہ کبھی ایسا خیال اپنے ذہن میں نہیں آنے دوں گا۔"

کیسا خیال ؟ —— اس نے اٹھ جھکا کر ابھری ہوئی پلاسٹک کی چادر پر انگلیاں پھیریں۔

"تمہیں نہیں پتا ؟ —— وہ حیران رہ گیا۔ آبشار خشک اور آنکھوں کے شیشے بالکل صاف ——

"نہیں۔"

"نہیں تمہیں پتہ ہے۔ تم خواہ مخواہ بن رہے ہو۔ ابھی میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔"

"عجیب پاگل آدمی ہو۔ میں تو الف بے تک نہیں پڑھ سکتا۔ خیال کیسے پڑھ سکتا ہوں۔"

"میں یونہی ڈر گیا تھا۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ یقیناً یہ جھوٹ کہتا ہے۔ اگر یہ واقعی لاعلم ہے تو اس کی باتوں میں تمسخر کیوں ہے۔ شاید میرا وہم ہو۔

"تم جاؤ۔ میرے کام میں حرج ہو رہا ہے۔ اس نے پلاسٹک کی چادر پر اپنی آنکھ گاڑتے ہوئے کہا۔

"تم کون ہو؟ — بڑے آرام سے یہ سوال اس کی زبان سے پھسل گیا اور وہ اپنی جرأت پر حیران رہ گیا۔

"میں؟" اس کی آنکھ بڑی تیزی سے پلاسٹک کی چادر سے نکل کر اس کی آنکھوں میں پیوست ہو گئی۔ اس کے پیٹ میں خلا پھیلنے لگا۔ میں نے یہ کیوں پوچھا۔ خلا پیٹ میں رینگتا ہوا اس کے حلق میں آکر اٹک گیا۔ مجھے متلی کیوں ہونے لگی ہے۔ یہ عجیب سایہ ہے کہ روشنی میں بھی سینے کو چاٹتا ہے اور اندھیرے میں بھی حلق کو ڈستا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے حلق کو تھاما اور خشک تلخی کو نگلا۔ آنکھ اس کی آنکھوں میں پگھل گئی۔ مسکرا دی "میں یہاں صفائی وغیرہ کرتا ہوں۔"

"صفائی وغیرہ؟"

"بھنگی کہہ لو، خاکروب کہہ لو۔ چوہڑا کہہ لو۔ بعض لوگ مجھے سویپر بھی کہتے ہیں۔"

"تو یہ سویپر ہے یہاں کا۔ میں خواہ مخواہ خائف ہو رہا تھا۔ ہنہ۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ میں تمہیں سائیکلوپس سمجھا تھا۔"

"وہ کیا ہوتا ہے ؟"

"وہ ایک جن تھا جس کے ماتھے میں ایک آنکھ تھی اور"

"میں وہ نہیں ہوں۔" اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ نہیں جاتی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے ؟"

"جو نام مرضی آئے دے دو۔ خاکروب کہہ لو، مگر سائیکل نہیں۔"

"ناموں سے مجھے بھی دلچسپی نہیں۔ اسی لئے مجھے خود بھی اپنے نام کا پتہ نہیں۔ —— یہ جگہ کون سی ہے ؟"

یہاں مردوں کی چیر پھاڑ کی جاتی ہے۔ اس سامنے والے دروازے کے ساتھ کا دروازہ مردہ خانے میں کھلتا ہے۔ یہاں پر وہ لاشیں رکھی جاتی ہیں جن کا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے۔ یہ مردے ڈائیسکشن ہال میں نہیں آتے۔ اب تم جاؤ۔ مجھے بہت کام کرنا ہے۔"

"یہ بڑی دلچسپ جگہ ہے۔"

"ہاں ! مگر یہاں آنے سے لوگ ڈرتے ہیں۔"

"بے وقوف ہیں —— تم —— تم ہر وقت مسکراتے رہتے ہو ؟"

"سب کو مجھ سے یہی شکایت ہے۔"

پورے دس بجے تھے"

"اس وقت تم بیٹھے یہاں کیا کر رہے ہو ؟"

اس کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر بجلی کوندی اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے تھوک نگلی —— نہیں نہیں —— میں اپنا سوال واپس لیتا

ہوں۔ تھا کہ رب کا ہاتھ بڑی تیزی میں میز سے اٹھا اور دوسرے ہی پل پھر مٹھی بن
کر میز پر جا پڑا۔ اس کی غائب ہوتی مسکراہٹ پھر لوٹ آئی۔ معلوم ہوتا ہے۔
تمہیں الٹے سیدھے سوال کرنے کی عادت ہے۔ میں دن رات میں رہتا ہوں
جب لڑکے ڈیسیکشن کر کے جاتے ہیں تو میں زخموں کو فارملین سے صاف کرتا
ہوں تاکہ کیڑے نہ پڑ جائیں۔ پوسٹ مارٹم میں نکلے اعضاء کو فارملین کے مرتبانوں
میں محفوظ کرتا ہوں اور ہر قسم کی گندگی اور بو سے پاک رکھتا ہوں۔

سوں، سوں —— اس نے اپنی ناک کو انگلی سے ملا ——

” ہاں! — سنا ہے یہاں سے بو آتی ہے۔ لیکن بو کوئی چیز نہیں۔ مجھے تو
بو نہیں آتی۔ اچھا اب تم جاؤ۔ “

میرا یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔

اس نے ایک بار پھر ہال کا جائزہ ۔ ایک کونے میں سجی الماریوں میں بہت
سے مرتبان پڑے تھے۔ ” یہ کیا ہے ؟ “ —— وہ اس کا جواب سنے بغیر
اٹھ کر الماری کے سامنے جا پہنچا۔ دل، گردے، جگر، دماغ، جسم کے کٹے ہوئے
حصے اور بچے۔ نوزائیدہ بچے مرتبانوں میں بیٹھے ہوا ... ننھے ننھے منے
بچے۔ چند ایک نامکمل اور بہت سارے مکمل۔ پیاری پیاری ادھ کھلی
آنکھیں۔ بازو اور ٹانگیں پیٹ سے جوڑے۔ ٹھوڑی کو سینے سے لگائے
حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے دھیرے دھیرے
اپنا ہاتھ بڑھایا اور شیلف پر ایک مرتبان کو اپنی طرف کر لیا۔

” او دستوں۔

اس نے گھوم کر دیکھا۔ خاکروب اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ ”نہیں اسے مت نکالو۔ اگر مرتبان گر کے ٹوٹ گیا تو یہ جگہ خالی ہو جائے گی۔“ اس نے اپنی آنکھ کے مقناطیس کو اس کے اور قریب کرتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”آؤ ادھر آجاؤ۔“

اس کا سارا خوشگوار ہیجان اس کی آنکھوں میں کھو گیا اور وہ منہ لٹکا کے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ پہلی میز کے قریب پہنچ کر اس نے کہا۔ ”مجھے کوئی دلچسپی نہیں کہ تم کون ہو۔ کیوں آئے ہو اور ایسی ہی بکواس۔ اب تم مہربانی کر کے چلے جاؤ۔“

”کہاں جاؤں ؟“

جہنم میں جاؤ۔ جہاں مرضی ہے جاؤ۔ لیکن یہاں سے چلے جاؤ۔ اس نے بہت بے صبری سے پہلی میز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں جاؤں گا“ اس نے بچوں کی طرح ضد کی۔ ”مجھے یہاں بڑا سکون ملا ہے۔“

”او — تم کیا چیز ہو۔“ وہ بالکل اکتا گیا تھا —

”میں ؟“

میں ؟ — اس نے پتھریلی میزوں پر پلاسٹک کی چادروں میں لپٹے لوگوں کی طرف دیکھا۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ یہ میرا ہاتھ ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو ٹٹولا — یہ میرا جسم ہے۔ یہ میں ہوں ! اور سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔

اس لیے کہ میں ہوں۔ کسی طرح میں بھی یہ ملائم چادر اوڑھ کر پتھر کی نرم نرم سطح پر نہیں سو سکتا ؟ میں بہت تھک گیا ہوں۔

" میں یہ چادر اوڑھ کر یہاں سونا چاہتا ہوں۔

" تمہیں ڈر نہیں لگتا ہے؟"

"جب یہاں میری آنکھ کھلی تھی تو ڈر لگا تھا۔ اب نہیں ___ اور تمہیں ہے؟"

"نہیں" خاکروب نے پہلی مرتبہ اسے چھوا۔ جانے کیوں اس نے بڑی شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم جلد ہی اکتا جاؤ گے۔ تب تک تم یہاں جو چاہے کرو۔ لیکن میرے کام میں حرج نہ کرنا۔" اس نے پہلی میز کی طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس کی اس مہربانی کا شکریہ کس طرح ادا کرے۔ چلو شکر ہے اتنا تو مانا۔ اگر میں نے تھوڑی سی اور ضد کی تو یہ مجھے میز پر سُلا بھی دے گا۔ "اچھا!"

وہ اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا کر آگے بڑھ گیا۔ اس کا ہاتھ ہٹتے ہی اس کے جسم میں عجیب، اجنبی سی رَو دوڑ گئی۔ میرے لہو میں یہ کنکری کہاں سے آگری۔ میں سر سے پیر تک لرز گیا ہوں۔ اس نے خاکروب کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا۔ ہاتھ میں کٹا ہوا بازو پکڑے اس پر سے گوشت کھرچ رہا تھا۔ قریب ہی جسم کے دوسرے پرزے بھی پڑے تھے۔

"یہ مجھے کیا کر گیا ہے۔" اس نے اپنا کندھا سہلایا۔ جسم میں بہتے خون پر کنکریوں کی بارش، چھینٹیں، دائرے۔ دائرے میں اس کی طرف کیوں بڑھ رہا

ہوں ۔ میں اس کے پاس کیوں بیٹھ گیا ہوں ۔ اور دائرے ، میرا خون
جہاں کنکری گرتی ہے ، وہیں ایک خلا ابھرتا ہے ، اور اس کے گرد چھینٹیں ۔
یہ میرے اندر کیا ہو رہا ہے ۔ یہ چھینٹیں میرے ذہن کی دھند کو چاٹ رہی ہیں
تم نے میرے پہلے کندھے پر ہاتھ کیوں نہیں رکھا ۔ ـــــ سنو ـــــ سنو ـــــ دیکھو
دیکھو سائیکلوپس میں کیا ہوں ـــــ میں کون ہوں خاکروب ـــــ اور یہاں
کیوں آیا ہوں ـــــ سب کچھ چھٹ گیا ہے اور ـــــ

میری آنکھوں نے جب دیکھا تھا اور جس طرف بھی دیکھا تھا ۔ دھندلے
شیشے کی ایک بہت اونچی دیوار دور تک چلی گئی تھی ۔ اس کے پار کچھ نظر
نہیں آتا تھا ۔ میں اپنے لاغر ہاتھوں سے دیوار میں اس دروازے کو
ٹٹولتا رہا جو کہ وہاں نہیں تھا ۔ میری آنکھیں دیوار میں اس عکس کی تلاش میں
تھیں ۔ لیکن شیشہ اندھا تھا ۔ میں نے دیواروں کو اپنی آنکھوں کا نور پلایا ۔
لیکن دیواروں کی خشک کانٹے دار زبانیں میرے جسم پر رینگنے لگیں اور میں
بھاگنے لگا ۔ ایک دیوار کا خاتمہ اور دوسری کا آغاز ـــــ بھول بھلیاں ـــــ
زبانیں میری چاروں طرف ـــــ دروازہ کہاں ہے ۔ میں اس بھول بھلیاں
سے نکلنا چاہتا ہوں ۔ یہ لاتعداد مینوٹار مجھے نوالہ بنائیں گے ۔ ـــــ رسی کا سرا
کہاں ہے ؟ ـــــ رسی کہاں ہے ؟ ـــــ یہ زبانیں ـــــ یہ سینٹور بولتے
کیوں نہیں ؟ ـــــ آواز کہاں گئی ؟ ـــــ اتنی چپ ۔ ۔ ۔ اتنی خاموشی زبانیں
گنگ ۔ خاموشی بھی گنگ ۔

" یہاں اتنی خاموشی ؟ " میں اپنا سر ہاتھوں میں جکڑ کے پوری قوت سے

سے چیخا۔ لیکن میری آواز کسی نے نگل لی۔ میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میرے پٹھے اکڑ گئے اور میرے پیٹ میں غار۔ وہی متلی اور قے۔ یہ مجھے قے کیوں نہیں ہوتی؟ میں نے اپنے حلق میں انگلی ڈال کر قے کرنا چاہی۔ لیکن انگلی میرے منہ تک پہنچتے پہنچتے رک گئی۔ میرے بند کانوں میں دور کہیں سے گھنٹی کا رس ٹپکا۔ ٹن ٹن ٹن آواز آواز ——— میں اکیلا نہیں ہوں۔ میں ہوں موجود ہوں۔ میں نے آواز سنی ہے۔ آواز قریب آتی گئی۔ اور میں نے اپنی بے نور آنکھوں سے ایک مضبوط مردانہ ہاتھ کو اس چھوٹی سی گھنٹی کو ہلاتے دیکھا۔ میں نے تعظیم میں اپنے گھٹنے اور ہاتھ ٹیک دیئے اور اپنے محسن کے پیر چاٹنے لگا۔ یہ میری رسی ہے۔ یہ مجھے اس لیبرنتھ سے نکال لے گا۔ پیر چاٹتے چاٹتے میری زبان اتنی لمبی ہو گئی۔ کہ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے منہ میں کیسے ڈالوں گا۔ پیر میرے آگے آگے چلنے لگے۔ میں نے اس رسی کا سرا تھام لیا۔ دیواریں ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں اور دروازہ تھا کہ ہی نہیں تھا۔

میرے محسن نے گھنٹی میز پر رکھ دی اور مجھے گود میں بٹھا کر پچکارتے ہوئے میرے دانتوں میں گوشت کا ٹکڑا پکڑا دیا۔ مجھے پتہ چلا کہ اس کا نام پاؤلوف ہے۔ اور میرا نام پاؤلوف کا کتا۔ وہ گھنٹی بجاتا تو جانے میرے منہ سے رال کیوں ٹپکنے لگتی۔ وہ میرے منہ سے رال ٹپکتے دیکھ کر بہت خوش ہوتا اور پھر مجھے کھانے کو بہت ساری چیزیں دیتا۔ جب بھی گھنٹی بجتی مجھے بھوک لگ جاتی۔ وہ میرے منہ کے ذریعے سے نالی ڈال کر میرے پیٹ سے کچھ نکالتا۔

پھر میری بھوک مٹ جاتی، میرے سامنے دھندلے شیشوں کی دیواریں
ناچنے لگتیں، متلی ہوتی اور میں پیٹ تھام کر دیواروں سے سر ٹکراتا، گھنٹی
کی آواز، شیشے کی دیوار تھی، پار لوف ہر وقت بیٹھا ایک موٹے سے رجسٹر
پر تاش کے پتوں کے گھر بناتا رہتا۔ ایک مقام پر جب وہ ایک پتہ اور رکھتا
تو ساری عمارت گر جاتی اور وہ پھر گھر بنانے لگتا۔ میں اسے اس مشغلے میں
منہمک دیکھ کر شیشے کی بستی کی گلیوں میں پھرنے لگتا اور سوچنے لگتا کہ میں
کتا نہیں ہوں کیونکہ ۔

میرے ماں باپ نے مجھے انسان جنا تھا اور میں انسان ہوں، لیکن
مجھے کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی، میرے والدین بڑے پریشان رہتے
تھے کہ میں کتابیں چاٹتا چاٹتا فقرے کا اختتامیہ نقطہ بن جاؤں گا۔ میں اپنے
والدین کے اس خوف سے بڑا محظوظ ہوتا تھا، اور ان کی عقل پر حیران
ہوتی جو کہ بالکل اوسط درجے کی تھی۔ جملے کا اختتامیہ نقطہ کتنی بڑی بات
انھوں نے کتنی آسانی سے کہہ دی تھی۔ میں بہت خوش تھا کہ میں عنقریب
جملہ کا خاتمہ بننے والا ہوں۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا قلم کاغذ کی سطح کی طرف دھیرے
دھیرے بڑھ رہا ہے۔ ٹک — اور ختم — قلم کی نوک کاغذ میں چبھنے ہی
والی تھی کہ میرے والدین کو بڑی اچھی ترکیب سوجھی۔ انھوں نے میری
تمام کتابیں جلا دیں اور مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے سب لوگوں کی طرح
زندہ رہنے کی کوشش نہ کی تو مجھے گھر سے نکال دیا جائے گا۔ تب میں سا
... رہوں گا، یہ میرا مسئلہ نہیں تھا، مجھے صدمہ یہ تھا کہ میں

اپنی کتابوں کے ساتھ دوستی نہ ہو سکا، نقطہ نہ بن سکا۔ میں ہر وقت کتابوں کی راکھ کے پاس بیٹھا چٹکی چٹکی راکھ اپنے سر میں ملتا رہا، زخموں پہ لگاتا رہا۔ سب طعنے دیتے تھے کہ کچھ کرتا کراتا نہیں۔ چوبیس گھنٹے راکھ پھانکتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے بہتر اور کام کیا ہو سکتا ہے۔ راکھ پر میرا گزارہ نہیں ہو رہا، پھر محلے کی عقلمند بڑی بوڑھیوں نے میری ماں کو مشورہ دیا کہ میرا بہترین علاج شادی ہے۔ مجھے اس علاج میں حرکت نظر آتی تھی، زندگی نظر آئی۔ یہ سب کچھ اسی تحریک کا قصہ تو تھا تو پھر یہ کیوں — آخر یہ سب کیوں، اس لئے کہ — تو پھر — یہ اس لیے کہ

پھر، پھر — پھر ——؟

تو ——؟

فل سٹاپ ——؟

جملے کا آغاز ہی نہیں ہونا چاہیئے تاکہ نقطہ بنانے کی کشمکش نہ کرنی پڑے۔ لیکن اس جملے کا نقطہ کہاں ہے۔ ماں! میں یہ فل سٹاپ ڈھونڈ کر لاؤں! پھر تم جو تی میں آئے کر لینا۔ میں اس نقطے کی تلاش میں گھر سے بھاگ کھڑا ہوا اور شیشے کی دیواروں کے لیبرنتھ میں گھر گیا۔

پیاز کے چھلکے اور چھلکے تھے اور اس کے اندر اور چھلکے —— جب میرے ہاتھ میں پیاز چھوٹا ہوتا چلا گیا تو میں بہت گھبرایا۔ پاؤ وقت بھی مجھے نقطہ ڈھونڈ کے نہ دے سکا۔ اگر میرے والدین کو پتہ چلتا تو بہت خوش ہوتے کہ چلو بیٹا کچھ کما رہا ہے۔ ایک لمحہ نہ جب پیاز کے مرکز کے گرد،

چھلکوں کے چند ایک دائرے ہی رہ گئے تو میں تذبذب میں پھنس گیا،
کہ آگے بڑھوں یا نہ۔ مجھے ہر وقت متلی ہونے لگی تھی۔ پاؤلوف مجھ سے
بہت ناراض تھا کیونکہ وہ پتھروں کے بٹتے گرتے گھر سے بہت تنگ آ گیا
تھا، اس کی عمارت نہیں بنتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ڈاکٹر اس میں میرا
کیا قصور ہے۔ مجھے ہر وقت متلی رہتی ہے۔ اس نے مسکرا کے اپنی لمبی
الجھی ہوئی داڑھی میں کھجلی کی، مسکرایا اور مجھے بے ہوش کر دیا۔ جب میں اٹھا
تو میرا پیٹ میرے سامنے پڑا تھا۔ پاؤلوف گھنٹی بجا رہا تھا اور میری کھانے
کی کٹی نالی سے سیال مادہ ٹپک رہا تھا۔ وہ پھر رجسٹر پر تاش کے گھر بنانے
لگا۔ وہ جب اپنی عمارت پر آخری پتا رکھنے لگا تو میں نے اپنے ہاتھ میں پیاز
کو دیکھا۔ میرے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ نقطہ بھی نہیں۔ زمین پر پیاز کے چھلکے
گرے پڑے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں اسی وقت پاؤلوف کے گھر سے بھاگ آیا۔ نقطے کی تلاش میں
بھاگنے لگا۔ بھاگتا رہا۔ اپنے پیٹ کے خلا کو تھامے ہوئے۔ متلی کو
سینہ میں چھپاتے ——— پسینہ پسینہ، آنکھوں میں پانی ——— جہاں جہاں
قطرے گرے وہیں پھر دیواریں اگنے لگیں۔ جہاں جہاں میری ایڑی پڑی وہیں
وہیں دیوار اگ آئی۔ رات۔ رات تھی نہ دن تھا، روشنی اور تاریکی کا تضاد
پاؤلوف کے گھر میرے پیٹ میں رہ گیا تھا۔ میں ایک عجیب بلگجے سے رنگ
میں گھل رہا تھا۔ دھندلے شیشوں کی اگتی دیواریں آسمان سے جا ملی
تھیں۔ پھر جیسے ہی چاروں اور، اور میں پھر دروازے کی تلاش۔

میں لڑکھڑانے لگا۔ دروازہ کہ جو وہاں تھا اور نہیں تھا، پھر جانے کیا ہوا میری
آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہونے لگیں۔ میں نے بے اختیار ہو کر مایوسی میں
اپنا سر زور سے ٹکرایا ہوگا۔ مجھے اتنا یاد ہے ایک نہیں کئی نقطے میری طرف
بڑھ رہے تھے اور میں بہت خوش تھا، بہت خوش کہ پیار کے مرکز میں مایوسی
نہیں بلکہ نقطوں کی ماں ہے۔ اس لئے کہ وہ نہیں ہے اور جو نہیں ہے وہ
ہے۔ رنگ محل جس کا کوئی رنگ نہیں۔ گہرائی جس کی کوئی گہرائی نہیں، کوکھ
جس کی [illegible] کوکھ نہیں۔ میں جس کا کوئی [illegible] نہیں۔ میں نہیں کو پا رہا تھا نہیں
جو کہ نقطہ تھا، نہیں تھا۔

کہاں، کہاں۔

نقطے میں سے یہ چھوٹی سی لکیر کیوں نکل آئی ہے۔۔؟

گویا!

وہ ملگجا رنگ چھٹ گیا۔ چھٹ گیا۔ میں نے حیران ہو کر دیکھا۔ نرسیں
ڈاکٹر، شیشے، دیواریں۔ تم نے مجھے روشنی کیوں دی۔ تاریکی کیوں دی؟

دیوانہ

میں بہت خوش تھا۔ بہت خوش۔ لیکن تم نے مجھے کوکھ سے چھین لیا

پاگل۔

میرے جسم پر سلاخیں تھیں۔ مجھے زندگی میں پہلی بار اپنا لباس نظر آیا۔
میں شروع ہی سے اس قید میں تھا کہ ان لوگوں نے مجھے ڈالا ہے؟
وقت جو کہ گزرا نہیں تھا۔ گزرنے کا لمحہ جو کہ بے جان تھا۔ میری گردن کو

اپنے دانتوں میں چبانے لگا۔ اور میں بڑے کرب میں ۔ امید ہے بچ جائے گا۔

کیوں، کیوں؟ نہیں نہیں تم نے مجھ سے نقطہ چھین کر یہ نقطہ مجھے دے دیا ہے۔ میں پھر اسی تلاش میں وہاں سے نکل آیا ہوں۔ تم سچ کہتے ہو، میں ہسپتال سے بھاگ آیا ہوں۔ میں بہت اکتا گیا ہوں، تم یوں کرو کہ مجھے میز پر ڈال کر پلاسٹک کی چادر اوڑھا دو، تاکہ میرا عذاب ختم ہوں ۔۔۔؟

"ہوں ؟ اس نے فرش پر پڑی ہڈیوں اور گوشت کے ریشوں سے اپنی نگاہیں چھڑا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ اسی پہلی میز کے کنارے بیٹھا، پلاسٹک کی چادر سے نکلا ہاتھ پکڑے جانے کیا کر رہا تھا۔ یہ بار بار میز کے پاس کیوں چلا جاتا ہے۔ وہ اٹھ کر خاکروب کے پاس آیا۔ اس نے وہ ہاتھ فوراً چادر کے نیچے چھپا دیا۔ اور سامنے کھڑا ہوا۔ تم اٹھ کر چلے کیوں آئے۔

"مجھے تمہاری باتوں میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ہر لمحہ جو کر تھا۔ میں نہیں رہنا چاہتا تھا اسی لئے مجھے خود پتہ نہیں تھا کہ میں کون ہوں۔ اب اتنی مشکل سے مجھے کے دانتوں میں جان پڑی ہے تو تم ۔۔۔" وہ اسے الوؤں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ "ہاہا، تم نہیں سمجھو گے۔ آخر تم سویپر ہو۔"

خاکروب کے ہونٹ اسی مسکراہٹ میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے میزوں کی طرف اشارہ کیا۔

"تو تم بھی ان کی طرح ۔۔۔"

"ہاں ہاں" اس نے بے صبری سے کہا۔

"وقت تو آ لینے دو۔"

"وقت آگیا ہے۔"

"اچھا! ادھر آؤ۔ نہیں ایک چیز دکھاؤں" اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیل گئے۔ "نہ۔۔۔ نہ۔۔۔ اس کو نہ چھوؤ" اس نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔

اس نے فوراً اپنا ہاتھ چادر سے ہٹا لیا۔ یہ مجھے اس میز سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ "پہلے مجھے یہ دکھاؤ۔" اس نے اشارہ کیا۔

"نہیں"، پہلی مرتبہ اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ مکمل طور پر غائب ہو گئی۔

میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں شراب پلا کر بے ہوش کر دوں اور تمہاری آنکھ نکال لوں۔

"ادھر آؤ۔"

وہ چپ چاپ کچھ کہے بغیر اس میز کو کنکھیوں سے دیکھتا اس کے ساتھ مردہ خانے میں آ گیا۔ مردہ خانے کی کھڑکی میں کوئی سایہ لپکا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے خاکروب کو دیکھا۔ "چوکیدار ہے" اس نے ایک جھٹکے میں تختے پر پڑی چادر ہٹا دی۔ "اس نے بھی یہی خواہش کی تھی دیکھ۔۔۔" اس نے پھر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ چوکیدار کہیں دیکھ نہ لے میں اس کے پاس جاتا ہوں" اس نے مڑتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں

دیکھو اس میرمس کے قریب نہ جانا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ پھر میں تمہیں میز پر نہیں سلاؤں گا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور لرزتا لرزتا تختے کے قریب گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے لاش کو چھوا۔ جسم برف تھا۔ اکڑا ہوا۔ اس کے دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے، جیسے کوئی کھلکھلا کر ہنس دے اور آنکھیں چھت میں گڑی تھیں۔ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سرگوشی کی۔

"ہیلو! تم بھی میری طرح تھے؟ تمہارے جسم پر زخم تو کوئی نہیں۔ تم نے زہر کھایا ہوگا۔ اور اطمینان سے ترمین تنہ بن گئے ہو گے۔ بس ٹھیک ہے، خاکروب جلدی لاؤ چادر۔

"خاکروب — سویپر — سائیکلو — د — و — بس" ابھی نہیں آیا؟ تو بس اب میں وہ چادر اٹھا کے دیکھوں گا اور الماری سے مرتبان اٹھا کے اس میں سے بچہ نکال کر اسے پیار بھی کروں گا۔ اس پر خوشی کے مارے ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ جلد از جلد ہال میں آ کر اپنی دریافت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جس ہاتھ کو پکڑ کر اس نے ہیلو کہا تھا وہ اسے چھوڑتا نہیں تھا۔ اس کا سانس رک گیا۔ اس کی اپنی آنکھیں جامد ہو کر خلا میں اتر گئیں۔ دل بہت زور سے سینے کے ساتھ ٹکرایا اور پھر تیزی سے چلنے لگا۔ اس کی نگاہیں لرزتی لرزتی لاش پہ آ کے رینگنے لگیں۔ اس کے جسم میں یک دم گرم رو دوڑ کر سرد ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ برف اس کی انگلیوں میں سرایت کرنے لگی۔ اس جسم کا نیل چمکنے لگا۔ جسم تن گیا۔ پھر ڈھیلا۔ پھر تناؤ، تڑپ

تڑپ، منہ میں جھاگ، زندگی بے جان تھی۔ نقطہ زہریلا، پھانسی، مسلسل پھانسی، مسلسل عذاب۔ ڈیلے باہر نکل کر تکنے لگے تھے۔ تناؤ، جھاگ، اذیت، تڑپ نہیں میرا عذاب تو سر میں تھا اور یہ سارے جسم میں ——— میرا ہاتھ برف ہو گیا ہے۔ چھوڑ دو ——— میرے ہاتھ میں شدید درد ہے۔ کرب میں اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ ——— میرا ہاتھ چھوڑ دو۔

ہنسی ——— قہقہوں کی بازگشت ———

اس نے بوکھلا کر نظریں اٹھائیں۔ لاتعداد سانپ سر اٹھائے جھوم رہے تھے، یہ بازو تو نہیں؟ ہمارے سینے سے لگو۔ دیکھو کتنا گرم ہے کتنا سرد ہے ——— معتدل ہے ——— نہیں ——— میں زمین کے مرکز میں گونجتی سونے کی جھنکار نہیں، بلکہ زمین میرے سینگ پر گھوم رہی ہے میرا سینگ درد میں چور چور ہو رہا ہے، دوسرا سینگ ہے نہیں۔ نہیں ——— میں نے لوگوں سے کبھی نہیں کہا تھا کہ یوں ہونا چاہیئے اور یوں ہوگا اور جب یوں نہ ہوا تو میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ اس لیئے نہیں ہوا لہٰذا میرا کوئی قصور نہیں۔ پھر کسی سر پھرے نے گولی مار دی۔ زخم سے بہتا ہوا خون سانپ چوستے رہے۔ زخم میں ربڑ کے دانت تھے، سانپوں کے سر محفوظ۔ ان کی لمبی لمبی زبانیں اپنے کام میں مصروف۔ خارش ہوتی ہے ... نہ ختم ہونے والی خارش، مڑا تڑا بھیانک چہرہ۔ اذیت۔ عذاب ——— نہیں نہیں ——— ہا ہا ہا ——— کتنے لاشں کو لیئے پھرتے ہیں ———

ہمارے سینے سے لگو، نہیں یہ سانپ تو نہیں ـــــ یہ تو آگ ہے آگ کے شعلے لہرا رہے ہیں۔ شعلوں میں ایک رانی سنگار کئے کسی کے سرہانے بیٹھی ہے ـــــ بچاؤ ـــ بچاؤ ـــــ لیکن آواز نہیں آتی جسم پر آبلے ابھر رہے ہیں ـــــ پانی پانی ـــــ جسم آبلہ بن گیا ہے پانی عذاب ـــــ میرے چہرے کو کیا ہو رہا ہے۔ اگر میرا جسم اس سے زیادہ تنا تو ٹوٹ جائے گا۔

آبلہ پھوٹ بہا ہے۔ آبلے میں وائرس۔ لہریں۔ چاند کو چاٹتی سمندر کی لہریں۔ ـــ آؤ ـــــ ہمارے سینے میں اترو ـــــ میں ڈوبتا کیوں نہیں۔ اف میرا سانس ـــــ میں نیچے ہی نیچے اتر رہا ہوں۔ میرا جسم گل رہا ہے۔ مچھلیاں گوشت نوچنا چاہتی ہیں۔ لیکن گوشت اترتا نہیں۔ شارک کے دانت بیکار ہیں ـــ درد ـــ بے پناہ اذیت ـــــ عذاب ـــــ مسلسل عذاب بہت، بہت، بہت کرب میں ہوں ـــــ تتلی میرے بالوں کی تالی پر آ کے جم گئی ہے ـــــ میں اپنا علاج کرانا چاہتا ہوں۔

ہم لاوارث ہیں۔

نہیں میرا ہاتھ چھوڑ دو ـــــ میں ہسپتال واپس جانا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر ابھی وہیں ہوگا۔ اس نے کھڑکی سے ہسپتال کی گھڑی دیکھی۔ دس بجے ہیں ابھی صرف دس ہی بجے ہیں؟ یہ گھڑی خراب ہے۔ میرا ہاتھ چھوڑ دو۔

رفتہ رفتہ اس کا ہاتھ نیلا ہونے لگا تھا۔ برف آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ نہیں۔ میں اس نیلی برف کو آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔ اس نے

پاس پڑے پوسٹ مارٹم کے اوزاروں سے آری اٹھائی اور پاگلوں کی طرح اس کا ہاتھ کاٹنے لگا۔ ٹھنڈی نیلی برف کی کرچیاں تیز رفتاری سے اس کے بازو میں چبھنے لگیں۔ ہاتھ کٹ گیا تھا۔ لیکن کرچیوں کی چبھن اور بھی تیز ہو گئی تھی۔ وہ اپنا بازو دوسرے ہاتھ کی گرفت میں لئے لڑکھڑاتا ہوا آیا پہلی میز کے کنارے آگے وہ گرنے لگا۔ اس نے اپنا بازو چھوڑ کر میز کا کنارا تھام لیا ——— اور ——— پہلی میز ——— اس نے اذیت بھول کر ایک ہی جھٹکے میں پلاسٹک کی چادر میز سے اتار پھینکی۔ خون کی نوکیلی کرچیاں بازو تک آ کے یک دم رک گئیں ———

روشندانوں میں پر پھڑپھڑائے ——— غٹرغوں، غٹرغوں ———

اس کے بالوں میں چاندی تھی۔ راکھ تھی۔ ہونٹ سرخ تھے، بے دانت جبڑوں میں پھنسی زبان سرخ تھی اور آنکھیں ——— یہ تو مجھے دیکھ رہی ہیں۔ میری آنکھوں کو چیر کر میرے سر میں دیکھ رہی ہیں۔ جھریوں سے اٹا چہرہ۔ اس کے گلے میں کانٹوں کی کنٹھی تھی اور سرخ قطروں کا ہار۔ سارے جسم پر سلوٹیں ——— ہڈیوں کا ڈھانچا سا ——— مگر چھاتیاں اتنی جوان جیسے دودھ بھری چھاتیوں پر سلوٹیں کیوں نہیں ہیں؟

اس نے اپنا ہاتھ دیکھا۔ بازو کا درد رفتہ رفتہ اتر رہا تھا اور ہاتھ کے شکنجے کی گرفت بھی ڈھیلی ہو رہی تھی۔

عجائب گھر سے اس کے پاس بیٹھا کیا کر رہا تھا؟ ——— وہ بار بار اس کے ہاتھ کو چھپاتا تھا۔

ہاتھ۔

اس نے فوراً اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اس کی ایک انگلی سے کریہہ بھونڈی بڑی سی چمکتی ہوئی انگوٹھی تھی۔ انگلی کے گرد خشک زخموں کے نشان تھے۔ تو وہ یہ انگوٹھی اتارنے کی کوشش کر رہا تھا ——— چور ——— لیکن اسے اپنے اوپر کتنا اعتماد تھا ——— بالکل گھبرایا نہیں۔ کہیں وہ آ نہ جائے۔ میں یہ انگوٹھی اتار دوں گا۔ سونا ——— سونا، پالیا ——— اس نے انگوٹھی کو پکڑ کر اتارنا چاہا۔ انگوٹھی کو چھوتے ہی اس کا دوسرا ہاتھ شکنجے سے آزاد ہو گیا۔ اس نے میز پر پڑی چھینی اور ہتھوڑی اٹھائی اور ایک ضرب میں انگلی کاٹ کر انگوٹھی اتار لی۔ انگوٹھی جیب میں ڈالتے ہوئے اس کی نگاہیں الماریوں میں پڑے مرتبانوں کی طرف اٹھیں۔ وہ لپک کر وہاں سے آگے کھسکا۔ مرتبان اٹھا لیا اور ڈھکنا کھول کر اس میں سے بچہ نکال لیا۔ بچے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جانے اس کے اپنے ہونٹ کیوں مسکراہٹ میں پھیلتے پھیلتے ہنسی میں پھٹ گئے۔ اس نے ہال میں لگے کلاک کی طرف دیکھا۔

دس بجے ہیں ؟ یہ کلاک بھی خراب ہے۔ لیکن ٹک ٹک کی آواز تو آ رہی ہے۔ ——— ڈاکٹر کہیں چلا نہ گیا ہو ——— ؟ اس نے پاگلوں کی طرح ہنستے ہوئے وہ نوزائیدہ بچہ، بوڑھی جھریوں سے منڈھی سوکھی رانوں کے درمیان رکھ دیا۔ جیب سے انگوٹھی نکال کر ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لی اور ہنستا ہوا ہال سے باہر نکل آیا۔

وہ پاگلوں کی طرح ہسپتال کی طرف بھاگنے لگا ——— لیکن سامنے وہی

دھندلے شیشے کی دیوار تھی۔ ہسپتال کہاں ہے؟ ——اوہ ہاں یہ سامنے رہیں ہسپتال کی سیڑھیاں۔ لیکن یہ دیوار پر کیوں چڑھ رہی ہیں—— وہ—— وہ—— دور آخری سیڑھی پر ڈاکٹر۔ —— وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ڈاکٹر اور دور۔ ڈاکٹر اور دور —— میرے قریب آؤ ڈاکٹر میرے پاس سونے کی انگوٹھی ہے —— اسے میری انگلی میں پہنا دو۔ سیڑھیاں ختم ہونے میں نہیں آتیں میں تھک گیا ہوں۔ ہانپنے لگا ہوں میں اس سے زیادہ تیز سانس نہیں لے سکتا۔ نہیں میں رکوں گا۔ میں چکرا کیوں رہا ہوں —— متلی چکر سیڑھیاں چڑھتے اس کی آنکھوں میں زمین گھوم گئی۔ نیچے نوکیلے پتھروں کی تیز نوکیں چمک رہی تھیں۔ متلی —— چکر —— چکر —— میں کس چیز کو تھاموں؟ اس کے قدم لڑکھڑا گئے —— متلی —— ارے میں پھسل گیا ہوں، مجھے قے ہو رہی ہے۔ میں گر رہا ہوں۔ گر رہا ہوں، میرا چہرہ بھیانک ہو رہا ہے اور اذیت، عذاب، متلی، مسلسل قے۔ خلا میرے گرد بڑھ رہا ہے۔ نوکیلے پتھر میرے جسم میں اتر گئے ہیں، میرے گرد خلا سمٹ کر نقطہ بن رہا ہے، میرے ہاتھ سے انگوٹھی نکل کر چلنے لگی ہے میں دھندلے شیشوں کی دیوار کے پیروں میں پڑا ہوں۔ میرا خون انگوٹھی کے پیچھے دوڑ رہا ہے شیشے کی دیوار میں دروازہ دیکھ رہا ہوں جو کہ نہیں تھا۔ میرا خون انگوٹھی کا پیچھا کر رہا ہے۔ انگوٹھی کا رخ دروازے کی طرف ہے۔ دروازہ پیچھے ہٹتا جا رہا ہے، میرے کانوں میں قہقہے گونج رہے ہیں —— کے قدم میں [illegible] کر رہا کا چہرہ [illegible] گیا ہے — انگوٹھی [illegible]

کی طرف ہے ۔ اور یہ میرا خون اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے — بھاگ رہا ہے — بھاگ رہا ہے — بھا گ — ر — ہا — ہے ! —

نہ مرنے والا

وہ نیچے پان والے کی دوکان کے ریڈیو پر پورے اعلانات سنے بغیر ہی کمرے میں لوٹ آیا تھا۔ نالیوں میں بہتا ہوا خون اس کے رونئیں رونئیں میں پسینہ بن کر تھرک رہا تھا۔ کمرے کا تالا کھولتے کھولتے وہ جھنجلا گیا۔ تالا ہمیشہ چابی کے پہلے پھیر میں کھل جایا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت چابی ہی اندر نہ جا رہی تھی۔ اس نے مضبوطی کے ساتھ ایک ہاتھ سے تالے کو پکڑا اور اپنے آپ پر پوری طرح قابو پا کر تالا کھول لیا۔ دروازہ کھولتے ہی اس نے چابی نکال کے تالا پٹخا کے فرش پر دے مارا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اس کی گرفت میں پستول کانپ رہا تھا۔ "نہیں نہیں۔" وہ بڑبڑایا اور گرفت چھوڑ دی۔ چابی چھناکے سے فرش پر جا پڑی۔ یہ دیکھ کر اسے جھرجھری سی آ گئی اور اس نے میز کے کنارے کو انگلیوں سے

ہتھیلی میں نچوڑتے ہوئے سوچا —— آج ایسا موقعہ پھر کبھی نہیں آئے گا۔ اگر یہ آج بھی، پستول بن کر میرے ہاتھ سے پھسل گئی۔ تو میں آنے والی کل کے زنداں میں ہمیشہ کے لئے قید ہو جاؤں گا۔ اس کے سارے جسم کا پسینہ اس کی ہتھیلی میں جمع ہو کر میز کے کنارے سے ٹپکنے لگا۔ ایک قطرہ، دوسرا تیسرا لمحے ایک ایک کر کے ٹپک رہے ہیں۔ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں؟ اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ پنکھا بند تھا اور کھڑکی کے روزن سے آئی ہوئی آخری کرن اندھیرے کی گرفت میں سسک رہی تھی۔ اس کے سانس تیز ہو گئے۔ وہ بڑی تیزی سے بجلی کے سوچ کے پاس گیا اور ایک ہی جھٹکے میں بجلی اور پنکھے کے بٹن دبا دیئے۔ کرن مر گئی۔ پنکھے کی ہوا نے اس کے دماغ میں بھڑکتی لپٹوں کو لمحہ بھر کے لئے دبا دیا۔ اس نے کھڑکی کھول کر نچلا بٹن بھی کھول دیا۔ ریڈیو پر سے ہوئے اعلانات سنسناتے ہوئے اس کے کانوں سے گزر گئے۔ برسات کے دنوں کی خشک ہوا نے اس کے دماغ کی آگ کو پھر بھڑکا دیا۔ بجتی ہوئی فائر بریگیڈ کی گھنٹیاں خاموش ہو گئیں۔ اس نے گھنٹیوں کی آواز کی طرف دیکھا۔ مشرق کی طرف بڑی روشنی ہو رہی تھی۔ سورج تو اس طرف ڈوبتا ہے۔ یا سورج ابھی غروب نہیں ہوا اور یہ میرے کمرے میں اندھیرا ابھی ذہانت تیز کر رہا ہے اس نے گھوم کر چھت کی طرف دیکھا۔ بلب روشن تھا —— نہیں، نہیں، چھت سے ابھی تک کرن کا لہو ٹپک رہا ہے تو پھر صبح ہو رہی ہے؟ صبح ہے؟ اس کے سارے جسم کی گھبراہٹ نے آنکھوں میں آکر سارے شہر سے سوال

کیا۔ روشنی کی طرف سے آتا ہوا شور اس نے پہلی مرتبہ سنا۔ اس شور کی کئی کئی گونجیں جنہیں اس کے کانوں نے دو لفظوں میں ایک کر دیا تھا ——— صبح ہے!
اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ "تو یہ لمحہ بھی چل گیا؟" وہ چیخا۔
نیچے بازار میں قہقہے بلند ہوئے۔ اس کی نظریں آسمان سے اتر کر بازار میں آگئیں۔ بجلی کے کھمبے کے نیچے تین نوجوان کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کھمبے کی بیمار روشنی کا عکس چمک رہا تھا۔ پھر یہ عکس بجھ گیا۔ اور اس نے کوئی چیز اپنے تہبند کے ڈب میں اڑس لی تینوں پھر ہنسے اور بائیں بازار کی طرف مڑ گئے۔ اس نے پھر آسمان کی طرف دیکھا ایک بہت بڑے شہاب ثاقب کی لکیر آسمان کو کاٹتی ہوئی نگاہوں کی حد بن گئی ——— نہیں، سورج طلوع نہیں ہو رہا ہے۔ ——— وہ تو ابھی ابھی میرے سامنے ڈوبا ہے۔ آسمان سیاہ ہے۔ نگاہوں کی حد پر تو اور بھی کئی روشنیاں ہیں۔ جو کہ اندھیروں کی اپنی کرنوں سے ہیں۔ نگاہوں کی سرحد پر شور ہے۔ اندھیروں کی کرنوں کی آرتی اتر رہی ہے۔ لمحے کا ماتم نہیں۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلتے پھیلتے قہقہوں میں پھٹ گئے یہ اندھیرے کی روشنی صرف موقع ہے۔ لمحہ ہے۔ اور یہ لمحہ اس وقت تک نہیں بیت سکتا جب تک میں اس کمرے کی رگوں میں بہتی ہوئی روشنی کو نہ بجھا دوں۔ یہ روشنی مجھ سے نہیں تم سے ہے۔ ان کی کرنوں کی نوکیں زہر میں بجھی ہیں اور یہ لمحہ تریاق ہے۔ میں اس کا بڑی مدت سے منتظر تھا۔ اب میں یہ موقع نہیں جانے دوں گا۔

"آج تم زندہ بچ کر نہیں جاؤ گے"۔۔۔ وہ گھوم کر چیخا۔۔۔
اس کی نظریں بڑی تیزی سے دیواروں پر لگی تصویروں سے پھسلتی دروازے کے ساتھ پڑی ایزل پر آکے رک گئیں۔۔ "سنتے ہو۔" اس نے نامکمل قد آدم تصویر کو کھاجانے والی نظروں سے دیکھا۔ "لیکن تم ابھی تک آئے کیوں نہیں؟"
تصویر کی غیر مکمل مسکراہٹ مکمل ہو گئی۔۔۔ "تمہارے سر پر موت منڈلا رہی ہے اور تم مسکرا رہے ہو؟" اس نے بڑے غصے میں پیلٹ نائف اٹھالیا "میں تمہاری مسکراہٹ بہادوں گا۔ قتل کر دوں گا۔ وہ پاگلوں کی طرح چاقو ہاتھ میں لے کر تصویر کی طرف بڑھا۔
اس کا ہاتھ تصویر کے بالکل قریب جا کر رک گیا۔ اگرچہ تم مکمل ہو، مگر تمہارا عکس نامکمل ہے۔ جب تک کوئی چیز مکمل رہو اسے ختم نہیں ہونا چاہیئے۔ میں تمہارا اور تمہارے عکس کا اکٹھا خون بہاؤں گا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر پیلٹ اٹھالیا۔ اور چاقو سے کینوس پر سرخ رنگ پھیلانے لگا۔
اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ اور سگریٹ کا دھواں سرخ رنگ میں گھل کر اس کے گرد پھیلنے لگا۔ اس کا چاقو والا ہاتھ بڑی تیزی سے کینوس پر حرکت کر رہا تھا۔ پھیلتا ہوا سرخ دھواں سمٹنے لگا۔
سمٹتا رہا سرخ دھوئیں کا دائرہ تنگ ہوتا رہا۔ پھر بڑے بڑے سرخ ہاتھوں نے اسے کندھے پر اٹھا کر اس کی ٹانگیں پکڑ لیں۔۔ میں کہیں نہیں جانا چاہتا، میرے پاس وقت نہیں، وہ کلبلایا۔ اس نے پنکھے کی طرف

دیکھا ۔ پنکھا کافی ہٹ کر تھا۔ اس نے پنکھا تیز کرنے کے لئے اٹھنا چاہا۔ اس کی رفتار کم ہے ۔ اس نے سوچا ـــ لیکن وقت بھی کم ہے ـــ آج بمشکل موم جمی ہے ۔ اگر میں اٹھا تو لمحہ پگھل جائے گا۔ بہہ جائے گا۔ اس کے پیروں میں پڑے دھوئیں کے تسمے میں کئی گرہیں پڑ گئیں ۔ اس نے تنگ آ کر سگریٹ منہ سے نکال لیا۔ دھوئیں کی شکلیں مسکرا دیں ۔ اس نے سگریٹ کو دیکھا۔ تم میرے نہیں ہو۔ تم اس کے ہو ۔ اس نے سگریٹ سے تصویر کی طرف اشارہ کیا "تم ـــ تم اور تم" اس نے سگریٹ کو پیر سے مسل کر دھوئیں سے کہا "تم سب اس کے ہو، سازشی ہو۔ تم چاہتے ہو کہ میرے ہاتھ بندھے رہیں ۔ ؟ "

اس کی رگوں میں بہتے ہوئے دھوئیں کی سرخی پھیکی پڑنے لگی۔ آج میں اس سازش کو ختم کر دوں گا۔ اپنے جسم میں بہتے ہوئے زہریلے خون کو بدل دوں گا۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔ تم ابھی تک آئے کیوں نہیں ؟ تمہارے آنے کے بعد میں تمہاری ایک ایک چیز کو پھینک دوں گا ۔ یہ جگہ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ وہ دراز سے پستول نکال کر دیکھنے لگا۔ پستول اس کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا ـــ آج میرا ہاتھ کیوں کانپ رہا ہے۔ آج چلی ہوئی گولیوں کی بازگشت تو زنجیروں میں گونجنے سے پہلے ہی مر جائے گی۔ اب اسے میرے ہاتھ [illegible] میں اتنا مضطرب کیوں ہوں ؟ ـــ میری یہی حالت رہی تو نشانہ کہیں چوک نہ جائے ۔ اور میں پھر اندھیروں کی کرنوں کی انی پر گھومنے لگوں ۔

نہیں مجھے خود پر پوری طرح قابو پانا چاہیئے۔ —— وہ آتا ہی ہوگا

اس نے پستول میز پر رکھ دیا۔

دور گولیوں کی آواز۔

اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ افق پر ننھے اندھیرے جل رہے ہیں اس کی کنپٹیاں بجنے لگیں۔ آج ہر انسان کا اپنا قانون ہے اور ہر کوئی اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اور میں یہ موقع نہیں جانے دوں گا۔

اس نے پھر پستول اٹھایا اور رخ تصویر کی طرف کر دیا۔ اس کا ہاتھ پھر کانپنے لگا۔ میں ابھی تک بوکھلایا ہوا ہوں مجھے پرسکون ہونا چاہیئے ورنہ —— ورنہ اس نے پستول رکھ دیا اور پیالی میں تھرموس سے چائے انڈیلنے لگا —— جب وہ آئے گا تو میں مسکرا کے اس کا استقبال کروں گا۔" وہ مجھے دیکھتے ہی سینما میں چلنے کے لئے کہے گا۔ تو میں ہنس کے کہوں گا۔ ابھی چلتے ہیں۔ اتنی بھی جلدی کیا ہے۔ کافی پینی ہے نا۔ پھر میں بڑی ترکیب سے اس کے سامنے کسی بہانے پچھلے سالوں کے تعلقات کو دہراؤں گا۔ اپنی بہترین دوستی کا ذکر کروں گا۔ اس نے پیالی میں شکر گھولتے ہوئے سوچا آہستہ آہستہ۔ میں باتوں کو غصے میں لپیٹتا جاؤں گا۔ لڑکی کا ذکر اس طرح کروں گا کہ غصے میں کھولنے لگے۔ باتوں باتوں میں تلخی بڑھ جائے گی اور میں اس پستول کے ذریعے ہر قسم کی قید سے آزاد ہو جاؤں گا۔ اس نے شکر گھولتے گھولتے ایزل پر پڑی تصویر کو دیکھا اور مسکرایا۔ ابھی جب تم آؤ گے تو تم نہیں ہو گے۔ اب میں خود پر کافی قابو پا گیا ہوں۔ پیالی

اٹھانے ہوئے اس کی نگاہیں پیالی میں چائے کے بھنور میں آ گئیں۔ اس نے دیکھا کہ بھنور میں اس لڑکی کی پرچھائیں گھوم رہی ہے کیا مصیبت ہے۔ اس نے سوچا — میرا تصوّر مجھے ڈوبے گا — تمہارا تصور تمہیں لے ڈوبے گا۔ اس کے کانوں میں کسی نے سرگوشی کی خواہ مخواہ ہر وقت نہ سوچا کرو — اس کے دوست کی آواز آئی تم بہت IMAGINATIVE ہو۔ کیفے والا ڈاڑھی سوزا مسکرایا — تمہارا تصور تمہیں لے ڈوبے گا۔ لڑکی نے بھنور سے کہا۔ — لے — ڈوبے — گا — لے — ڈ — و — بے — گا — ا — ا — ا — اس کے کانوں میں بازگشت کی بازگشت تھی۔

"تم کہاں ہو؟" — وہ بھنور کے کنارے پہنچا۔

"وہ تم سے پہلے اس پاتال میں اتر گئی ہے۔" بھنور میں اس کے ہونٹوں نے اس سے کہا۔

"کس کے ساتھ؟ میں تو یہاں ہوں"

"تمہارے دوست کے سر پہ سانپ کا تاج ہے اور لڑکی کے سینے پر بائیں طرف دانتوں کے دو نشان ہیں۔ دل سے سنہری خون بہہ رہا ہے اور اس کی آنکھوں میں زہر بجھا خمار ہے۔"

"کہاں ہیں دونوں؟"

"پاتال میں — تاج کے سانپ کو دودھ چاہیئے۔"

"میں اس سانپ کو کچل دوں گا۔" اس نے بھنور میں چھلانگ لگا دی

چھنن ۔ ممن ۔ نن ۔ پیالی فرش پر گر کے ٹوٹ گئی چھنن ۔ چھن چھن چھن زنجیروں کا شور ـــــ وہ اٹھ کر بے قراری سے ٹہلنے لگا۔ اس کی نگاہیں دیوار پر جنگل کی تصویر میں بھٹک رہی تھیں۔ وہ۔ اس کا دوست اور لڑکی جنگل میں کھڑے تھے۔ چھن چھن۔ اس زنجیر کو اتار دو۔ اس نے لڑکی کے پیروں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا دوست تاج کے سانپ سے کھیلتا ہوا مسکرا دیا۔ یہ سونے کی ہے۔ سنو۔ یہ تمہارے پیچھے پیچھے جائے گی۔ اگر تم نے مڑ کر اسے دیکھ لیا تو تم اسے کبھی نہ پاؤ گے

اس نے جنگل کی تصویر کو گھورتے ہوئے سوچا۔ اگر مڑ کر پیچھے دیکھنے سے چیزیں غائب ہو جایا کریں تو آج میرے پیچھے کچھ نہ ہوتا۔ اس نے ہمیشہ مڑ کر پیچھے دیکھا تھا لیکن وہاں سب کچھ ہوتا تھا۔ ایک ایک نقش ـــــ ایک ایک آواز ـــــ زنجیر کی آواز آتی آتی بالکل بند ہو گئی تھی اور پیچھے اور دور ـــــ اور دور ـــــ اس مرتبہ اس نے گھبرا کے مڑ کر دیکھا تو لڑکی وہاں نہیں تھی۔ خلا تھا۔ کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ جنگل میں تھا اور ہر قدم راستہ تھا۔ جنگل اور خلا کے درمیان سونے کی زنجیر پڑی تھی۔ "تم فریبی دوست ہو۔" اس نے زنجیر اٹھالی "میں اسی سے تمہیں پھانسی دوں گا ـــــ قتل کر دوں گا۔ ـــــ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ ـــــ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ جنگل کے زنداں میں پاگلوں کی طرح گھومنے لگا۔ ہر قدم راہ پر تھا ـــــ اور ہر راہ تیغ سلاخ کی طرف جاتی تھی ـــــ میں تمہیں فنا کر دوں گا۔ وہ دھاڑا ـــــ میں تمہیں

دانتوں میں پکڑ کے جنگل میں گھسیٹتا پھروں گا۔ اور جب تم سسک سسک کر مر جاؤ گے تو میں پھاڑ کر کھا جاؤں گا۔ اس کی ہنسی سے سارا جنگل گونج اٹھا۔ اس کی انگلیاں زنجیر کو بری طرح ہاتھوں میں مسلنے لگیں۔ اس کی نگاہیں سارے جنگل میں گھومتی میز پر پڑے پستول پر جا پڑیں۔ اس نے ایزل کی تصویر کو دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ کو سرخ رنگ کی ٹیوب اس کے ہاتھ میں بری طرح کچلی گئی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔ "آج میں تمہاری موت کے بعد بھی نہیں مروں گا۔ آج اس قسم کا کوئی قانون نہیں ہے کہ انسان دوسرے کے مرنے کے بعد زندہ نہ رہ سکے۔ آج میں آزاد ہو جاؤں گا۔"

"تم میں اتنی ہمت ہے؟ تم مجھے قتل کر سکتے ہو؟"

اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ پھر تصویر کو۔ "کیوں نہیں۔ میں اس وقت بڑا پر سکون ہوں۔"

"میرے مرنے کے بعد اپنے دنوں کی قیمت کہاں سے دو گے؟"

"آج کے بعد میں نیا آدم ہوں گا۔"

"پیچھے مڑ کے دیکھنے پر تمہیں صرف زنجیر ملے گی۔"

"بکو نہیں۔"

تصویر ہنسی۔

"میں تمہیں مسخ کر سکتا ہوں۔" وہ دھاڑا۔ اور ہاتھوں کا سرخ رنگ اس پر پھیر دیا۔

"لیکن میں مٹا نہیں۔"

کھڑکی سے ایک بار اور گولیوں کی بوچھاڑ کی آواز آئی۔ اس نے لپک کر میز پر پڑا پستول اٹھا لیا ـــــ یہ دیکھو میرا ہاتھ کانپ نہیں رہا۔ میری اتنی مضبوط گرفت تو برش پر بھی کبھی نہیں ہوئی ـــــ وہ ہنسا۔ اب لمحہ میری مٹھی میں ہے۔ اب تمہارا نام و نشان بھی نہیں رہے گا ـــــ رہے گا۔ نہیں رہے گا ـــــ رہے گا ـــــ وہ پستول کا رخ اس کی طرف کر کے دائیں آنکھ کی سطح پر لایا ـــــ کس طرح نہیں رہے گا ـــــ

"کیا تم تنہا ہنستے رہتے ہو ـــــ تمہیں خود کلامی کی بہت بری عادت پڑ گئی ہے۔"

وہ اور بھی زور سے ہنسا۔

"چلیے کافی پی آئیں ـــــ کیا کر رہے ہو۔ یہ پستول ـــــ کیا کر رہے ہو ـــــ اس کا رخ ـــــ کیا کر ـــــ"

"آزادی حاصل کر رہا ہوں۔" اس کے قہقہے پستول سے نکلتی گولیوں کی آواز پر چھا گئے۔

"مے ــ رے ــ د ــ و ــ ست" آواز زمین پر پہنچتے ہی، سرخ رنگ میں ڈوب گئی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے پستول اس کے سینے پر پھینک دیا۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کمرے سے نکل کر بازار میں آ گیا۔ آج کافی کا مزہ نیا ہو گا۔ وہ کیفے ڈی سوزا کی طرف چلنے لگا ـــــ میں نے اب جنم لیا ہے۔ اس نے بازار سے اپنے کمرے پر آخری نگاہ ڈالی۔ اگر یہ

لمحہ بھی گزر جاتا۔ تو میں اس کو گھر میں ہمیشہ قید رکھتا۔ اب میری زندگی کا ہر لمحہ میرا اپنا ہے۔ اب کسی پل پر بھی اس کی مہر نہیں ہو گی۔ اب میں سر اونچا کر کے چل سکتا ہوں۔ پہلے میری گردن پر اس زنجیر کا بوجھ تھا اور اب —— وہ اور بھی گردن اکڑا کر مسکرایا۔ اگر میں اس روز اسے قتل کر دیتا۔ جس دن میری گردن پر اس زنجیر کا بوجھ تھا اور اب —— وہ اور بھی گردن اکڑا کر مسکرایا اگر میں اس روز اسے قتل کر دیتا، جس دن میری گردن جھکی تھی تو میں آج سے بہت پہلے آزاد ہو گیا ہوتا۔ لیکن تب —— تب کون کہہ سکتا ہے کہ میرا ہاتھ نہ کانپتا۔ یا بعد میں میرے پیروں میں بیڑیاں نہ ہوتیں۔ لیکن آج میں بڑی آزادی سے گھوم رہا ہوں اور میرا ہاتھ بالکل نہیں کانپا؛ اس نے بجلی کے کھمبے کے نیچے سے گزرتے ہوئے اپنا ہاتھ دیکھا۔ سرخ رنگ اب بھی پھیلا ہوا تھا۔ اور ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے پریشان ہو کر مڑ کر دیکھا۔ اس کے گھر تک روشن بلبوں کی زنجیر خلا کو چیرتی چلی گئی تھی۔ اس نے پھر اپنا ہاتھ دیکھا اور فوراً دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیا —— میرا نشانہ —— وہ مرا بھی یا نہیں اسے مرنا چاہیئے وہ مر گیا ہو گا۔ لیکن میرا ہاتھ —— مجھے جلدی نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ کیا معلوم اسے گولی لگی بھی یا نہیں "لیکن میں مٹا نہیں،" اس کی آنکھوں میں تصویر مسکرا دی۔ لیکن زمین پر تو لال لال رنگ تھا، وہ، وہ —— اس نے پھر اپنے سرخ ہاتھ کو دیکھا —— نہیں۔ مجھے چاہیئے تھا کہ میں مسکرا کے اس کا استقبال کرتا۔ جب وہ مجھ سے کہتے چلنے کے لئے کہتا تو میں اسے سمجھاتا کہ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ کافی ہی پینا

ہے۔ پھر میں باتوں باتوں میں اسے غصے میں پاگل کر دیتا، خود پاگل ہو جاتا
پھر پورے اطمینان اور اعتماد سے اسے گولی مار دیتا۔ لیکن میں اس
سارے عمل سے پہلے ہی پاگل ہو گیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس کے سیڑھیاں
چڑھنے کی آواز آئی تھی جو کمرے میں آ کر بند ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن
میں قدموں کی آواز گونجنے لگی۔ ہاں وہ آیا تھا —— سنسان بازار میں اس
کے اپنے بوٹ چیخ رہے تھے۔ وہ میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر تصویر
کے پیچھے چھپ گیا ہو گا —— اور اب، اور اب —— بوٹوں کی آواز
اس کے دماغ پر برسنے لگی۔ —— ٹھک —— ٹھک —— ٹھک —— اس
نے کنپٹیاں دبا کر آنکھیں بند کر لیں اور پھر چلتے ہوئے اپنے پیروں
کو دیکھا —— نہیں میرے بوٹوں کی آواز اتنی نہیں ہو سکتی۔ وہ میرا پیچھا
کر رہا ہے —— تصویر کے پیچھے سے نکل کر آ رہا ہے۔ اس کے قدم
تیز ہو گئے۔ وہ مجھے پکڑ لے گا۔ اور پھر —— اور پھر میں ساری عمر ——
اس کے قدم تیز ہو گئے۔ ہر مکان کے بند دروازوں سے بوٹ
چرچراتے ہوئے اترنے لگے۔ دوڑو —— پکڑ لو —— یہ قاتل ہے۔
قدموں کی آواز اور تیز، اور تیز —— اور نزدیک اور قریب۔ دوسرے
کھمبے کے قریب سے گزرتے ایک سایہ اس کے پیچھے سے نکل کر اس
کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے نہ پکڑو۔ میں نے
قتل نہیں کیا۔ میرا ہاتھ کانپ گیا تھا۔ لمحہ میرے ہاتھ سے پھسل گیا ہے
میں، میں ۔ تم، تم، اس نے گھبراہٹ میں چلتے چلتے پیچھے گھوم کر

دیکھا۔ سایہ اس کے ساتھ چل کر آگے بڑھ گیا تھا۔ پیچھے کچھ نہیں تھا۔ زنجیر بھی نہیں۔ دور تک کھمبوں کی قطار اونگھ رہی تھی۔ مکانوں میں سناٹا تھا۔ تاریکی تھی۔ اکا دکا مکانوں کے ایک آدھ کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ سارا بازار خاموش تھا۔ کبھی کبھی گولی چلنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ یا دور نیم جان سا شور، یا فائر بریگیڈ کی دم گھٹی گھنٹیاں۔ نہ جانے محلے کے کتے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ وہ لمحہ بھر کے لئے رکا اور اس کے کان کسی بھی آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگے۔ اور اس کی نظریں کسی بھی جاندار چیز کو مٹکوں تک کے نیچے ڈھونڈتی ناکام لوٹ آئیں۔ تم نہیں ہو اس نے سوچا۔ ورنہ یقیناً تم میرا پیچھا کرتے۔ گولیاں چیر کے تم سے زندگی چھین لے گئی ہو گی۔ ورنہ اگر تم میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو کم از کم چیخ و پکار تو ضرور کرتے۔ پھر میں نے تمہیں خود گرتے دیکھا تھا۔ میں بھی خواہ مخواہ اپنے تصور کے بہاؤ میں آ گیا۔ وہ مسکرا دیا۔ اور آج تو میرا ہاتھ کانپ ہی نہیں سکتا تھا۔ آج تو کسی کا بھی ہاتھ نہیں کانپ سکتا تھا۔ وہ مکان پر نظریں دوڑاتا ہوا چلنے لگا۔ یہ سب لوگ بھی تو گھروں میں نہیں ہیں۔ وہ بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے گئے ہیں۔ اپنی اپنی گولیوں کی پیاس بجھانے گئے ہیں۔ کتوں کو بھی پتہ چل گیا ہے کہ آج قانون زندگیوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک نہیں رہا اسی لئے مجھے خود پر اعتماد تھا۔ میں نے تمہارے خون میں تمہاری آواز غرغراتی سنی تھی۔ مجھے یاد ہے تصویر نے کہا تھا میں مٹا نہیں اور میں نے تم دونوں کو اکٹھا مٹا دیا تھا۔ میرے

پستول کی نالی اب بھی بارود کے دھوئیں میں ہی تمہارے خون کی بو ہوگی
وہ مسکرایا۔ وہ پستول میرا نہیں ہے۔ یقین جانو میں نے تم کو قتل نہیں کیا
تم نے خود کو قتل کر دیا ہے۔ یا پھر تمہیں وہ لوگ مار گئے ہوں گے جو اندھیروں
کی لو کو اونچا کر رہے ہیں۔ میں نے پستول کا گھوڑا نہیں دبایا تھا۔ میں نے
تو صرف ریت گھڑی کے سوراخ پر انگلی رکھی تھی۔ گرتی ہوئی ریت بند
کی تھی۔ وقت کو خاموش کیا تھا۔ جانے گھڑی کا شیشہ کس نے توڑا
ہے۔ اس کے ہونٹ عیارانہ مسکراہٹ میں پھیل گئے۔ میں نے تو صرف
لمحے کی موم کو منجمد کیا تھا۔ تم قتل ہو گئے ہو۔ بیچ بیچ۔ ہوا کی گرہ بھی کھل
گئی۔ میں بھی آزاد ہو گیا۔

وہ کیفے کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ کیفے کا مالک دروازے
کے سامنے کاؤنٹر پر بیٹھا کیش گن رہا تھا۔ اس کی آہٹ سے یکدم چونک
کر اس نے نوٹ دراز میں رکھ کر فوراً چابی گھما دی۔ پھر اسے دیکھ کر اس
کی گھبراہٹ دور ہو گئی۔ "او"

"ہا ہیلو"

"اوہ میں۔ تم ادھر کیا کرتا۔ سائرن بجنے والا ہے۔"

"کافی پیئیں گا" ——— وہ مسکرایا۔

وہ اس سے ہاتھ ملا کر اس کے لئے سامنے کی میز والا پنکھا چلانے
لگا کہ اس کی نظریں اپنے ہاتھ پر جم گئیں۔ ——— "بلڈ ——— تم۔ تم بھی
آج۔"

وہ گھبرا گیا۔" ہاں ـــ نو ـــ نو ـــ نہیں ـــ یہ ـــ تو۔"

"گوش ـ یو ڈیم آرٹسٹ ـ پینٹ کرنے کے بعد ہاتھ تو دھو لیا کرو۔"

"شکریہ" اس نے رومال سے پسینہ پونچھا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ "کافی"

"سائرن بجنے والا ہے؟ تم آج بھی نہیں سوئے گا۔؟"

"او سویٹ انکل" ـــ وہ ہاتھ دھونے لگا

"یو ـــ آرٹسٹ"

وہ دروازے کی سامنے والی میز پر بیٹھ گیا۔

"تمہیں خوف نہیں آتا۔" وہ باورچی خانے سے بولا۔ "ریڈیو سنا تھا۔؟ انارہ کی ہے۔

"تو ـــ؟"

"تمہارا کوئی دشمن نہیں؟ ـــ کوئی تمہیں قتل کر دے تو؟"

وہ باورچی خانے سے ٹرے میں کافی وغیرہ لے کر آ گیا۔ "اں؟"

وہ ہنسا۔

"نو ـــ نہیں۔ اب میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔" ـــ وہ مسکرایا۔

"ارے تمہارا وہ فرینڈ کدھر ہے۔؟ ـــ نہیں آیا؟"

"میرا دوست۔" وہ کافی کی پیالی اٹھاتا ہوا ہنسا۔ "وہ وہ"

اس کی نظر پھر دروازے سے باہر جم گئی۔ اور اس کے ہاتھ سے

پیالی چھوٹ گئی۔ اس کا دوست سامنے سڑک پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جہاں اس کا دوست کھڑا تھا اور باہر سڑک پر آ گیا۔

وہ کیبنے میں پہنچا۔ "وہ ادھر ہیں — سائرن بج رہا ہے اندر آؤ۔ تم کیا کر رہے ہو۔"

وہ اس جگہ آ کے کھڑا ہو گیا، جہاں اس کا دوست مسکرایا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا، ہر طرف اندھیرے میں بس ایک سایہ تحلیل ہوتا نظر آتا تھا۔

"سائرن بج رہا ہے۔ بلڈی فول۔ کم ان۔"

موڑ مڑ کر سامنے سے آتی ہوئی روشنی نے یکلخت اسے اندھا کر دیا۔ ہارن۔ سائرن۔ ہارن۔ سائرن اور کیبنے کا مالک اسے عین جیپ کے سامنے سے گھسیٹ کر کیبنے میں لے آیا اور دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ "ہمبگ مین۔"

اس نے ہاتھوں سے آنکھیں مل کر شوکیس سے باہر دیکھا پھر اس کو اور پھر میز کو۔ پیالی اوندھی پڑی تھی اور میز کے کنارے سے پگھلی موم کے لمحے بڑی تیزی سے ٹپک رہے تھے۔

چوراہا

یہ دو سڑکیں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی آگے بڑھ گئی ہیں اور میں ۔

اس نے بس اسٹینڈ کے جنگلے سے اپنی کہنیاں ہٹائیں اور فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا ۔

اور میں ، اچھا تو جس جگہ پر یہ سڑکیں ایک دوسرے کو کاٹتی آگے بڑھ گئی ہیں یہ   ان سڑکوں کے دونوں طرف گڑھے ہیں اور یہ بلے چائے فٹ پاتھ زمین کے چہرے پر اداس لکیریں یہ بس کب آئے گی ۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا ۔ میں سینما سے تانگہ پکڑ لیتا تو اچھا تھا ۔ بس اسٹینڈ پر تو اس وقت کوئی بھی ——

اس نے سر گھما کر دیکھا ۔

یہ ابھی کون گزرا تھا ۔

اس کی آنکھوں میں روشن سایہ لپکا۔

لاحول ولا۔ یہ تو میری سیاہ پلکوں پہ کرن لرزی تھی۔ نہیں یہاں کوئی نہیں اور بس نہیں آئے گی۔ لیکن سینما کا آخری شو دیکھنے والوں کی سہولت کے لئے رات کے وقت سپیشل بسیں بھی تو چلتی ہیں۔ پر جانے اس روٹ پر بس آتی بھی ہے یا نہیں۔

اس کی نظریں دونوں سڑکوں پر چلتی ہوئی عین درمیان میں آکر رک گئیں وہاں سپاہی کا چبوترہ تھا اور اس کے بالکل اوپر پیلی روشنی کا ہالہ۔ یہ ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ یہ علیب کا وہ حصہ ہے جہاں۔

نہیں نہیں

اس نے فوراً اپنی آنکھیں وہاں سے ہٹا لیں۔ اس کی نظروں کی چھپکلیاں کھمبوں کی روشنی میں رینگنے لگیں۔

کوئی نہیں۔ کچھ نہیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے کیا۔

اور زنار یکی میں ابھرتی چٹانوں پر چڑھنے لگیں۔ کھڑکیوں میں اٹک اٹک کر۔

اندر کیا ہو رہا ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ پر میں تو ابھی ابھی سینما سے اپنا پیٹ بھر کر آیا ہوں۔ ہم کتنے مدہوش سے ہیں

عمارتوں کی چھت سے اس نے دیکھا۔ آسمان بالکل صاف تھا تارے چمک رہے تھے۔ استنے جب ۱/ ننگے برہنہ کہ اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ آخر میں یہاں کیوں بیٹھا ہوں۔ بھوک مجھے جانا جو ہے کہاں گھر اور کہاں اور یہاں

گھر۔ لیکن میرا گھر کہاں ہے۔

وہ اپنے سوال سے پریشان ہو گیا۔ اس نے چاروں اطراف جواب ڈھونڈا اس کی نگاہیں فٹ پاتھ سے ذرا ہٹ کر پڑی کنکریوں کی ڈھیریوں میں پھنس گئیں کنکریاں برہنہ ستاروں کا عکس تھیں۔

یہ ہر شے برہنگی کیوں نظر آ رہی ہے۔ کیوں نہ آئے تم صحیح لفظ کا استعمال جو کر رہے ہو۔ ہر شے اصل میں ننگی ہے اور یہ ننگا بھی کتنا ننگا لفظ ہے۔ اسے ہنسی آ گئی۔

میں نے لفظ کا کتنا خوبصورت جال بنا ہے۔

اور پھر فوراً ہی اس کے حلق میں دفن ہو گئی۔ فرلانگ بھر تنی ہوئی کالی نظروں سے اسے اندھا کرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اور عین اس جگہ پر کار نے ہے کسی نے جلتا ہوا سگریٹ پھینکا تھا۔ جہاں سپاہی کا چبوترہ تھا۔

دیکھو سگریٹ بھی کیسا عین چبوترے پر آن ٹکا رہا ہے۔ سڑکیں ایک دوسرے کو کاٹتی آگے بڑھ گئی ہیں۔ اور یہ صلیب کا وہ حصہ ہے جہاں کہ مردہ مسکراتا مسکراتا رہ گیا۔ کہیں گھڑیال نے ایک بجایا۔

ایک بجا ہے سارا [illegible] بارہ بجوں لگے نہیں [illegible] میری [illegible] ہے جو [illegible] جاتا ہے [illegible] نے تو وقت کا سرگوشی [illegible] آتا ہے جو [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible] ایک ساکت لمحہ [illegible] ہے [illegible] ہی بھاگتا ہے [illegible] کچھ نہیں بجا ہے [illegible] گھڑیال بجانے والا ہی چلا جا رہا ہے وقت ہی چلا جا رہا ہے یا یہ بازگشت ہے جب کا دائرہ خود ہی [illegible] گرد کھینچ رہا ہے اور پھر اس میں گرفتار ہو رہا ہوں میں اٹھ کر چلا کیوں نہیں جاتا یہ [illegible] میں اور آوازوں کی سازش ہے

گھڑ گھڑ گھڑ ڑڑڑڑڑڑڑڑڑڑ۔

بھئی مجھے معلوم ہے کہ بس اس وقت نہیں آئے گی۔

ڑڑڑڑڑڑڑڑ

اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مجھے معلوم نہیں مجھے کس سڑک سے گھر

جانا ہے۔

ڑڑڑڑڑ

یا کونسی سڑک میرے گھر کو جاتی ہے۔

پیں، پیں، پیں، پیپ۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ پیلی چھت والی سیاہ

کار کھڑی تھی۔

کبھی تو یہ ٹیکسی والے حرامی باپ کی نہیں سنتے "صاحب ہم کیا

کریں۔ مالک کہتا ہے کہ شام کے وقت اگر چالیس نہ دیئے تو" صاحب یہ

ایمپٹی پڑ جاتی ہے۔" صاحب۔ ہم مجبور ہیں" ــــ وہ کوئی مجبور نہیں

ہے۔ زمین کے ذرے ذرے سے لے کر آسمان ــــ میں پھر بہکنے

لگا ہوں۔ میں اس وقت بالکل مجبور نہیں۔ اگر چاہوں تو یہاں سے جا

سکتا ہوں تو پھر میں اٹھتا کیوں نہیں۔

"صاحب چلے گا" اور کبھی یہ ٹیکسی والے آپ کو کہیں نہ کہیں

چھوڑنے پر بضد ہو جاتے ہیں۔

"صاحب" ٹیکسی والے نے کھڑکی سے جھک کر کہا۔

رات بالکل چپ تھی۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف

کو ہٹ کر وہاں سے پانچویں کھمبے کے اندھیرے میں دو سائے آپس
میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اس نے جانے کس خوف سے کانپ کر
ادھر ادھر دیکھا۔

آس پاس آدم نہ آدم زاد —— صاحب —— اس ڈرائیور کی
بینت تو ٹھیک ہے۔ اس کی شکل تو دیکھو نیچے کو لٹکی ہوئی۔ خوفناک مونچھیں
اور آنکھوں میں سرخی قاتلوں ایسی۔ یہ قاتل ہے۔ میں اکیلا ہوں کہیں یہ
مجھے ؟

"کیوں صاحب ؟"

اس نے فوراً ڈرائیور کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور حلق
میں زور زور سے دھڑکتے دل کو نگل کر پرے دیکھنے لگا۔

"توڑ دو۔" اس نے غصے میں کار کا گیئر لگایا اور وہ ہوا ہو گیا۔ اس نے
دور تاریکی میں ڈوبتی کار کی سرخ روشنی دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

بھلا اس میں ڈرنے کی کیا بات تھی۔ یہ مجھے قتل کیوں کرتا۔ میری جیب
میں اس وقت فقط دو روپے ہیں اگر وہ مجھ سے مانگتا تو میں اسے دے
دیتا۔ بعض وقت ہم یونہی ایک دوسرے سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔
اس نے ٹھیک ہی کہا تھا تو ڈرو۔ لیکن میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ اگر ہوتا تو
میں اسے اس وقت ...... یہاں یوں اکیلا نہ بیٹھا ہوتا۔

سڑک کے کنارے ایک کتا کسی گہری سوچ میں ڈوبا خراماں خراماں
اس کی طرف چلا آرہا تھا۔ اس نے فٹ پاتھ کے کنارے سے چن کر ایک

کنکر اٹھایا اور پوری قوت سے کتے کی طرف پھینکا۔ کنکر سڑک کے کنارے سے ٹکرا کر دوسری سمت کو اڑ گیا اور ساتھ ہی اس کی نظریں بھی۔ —

اچھا تو یہ کنکر نہیں [illegible] تھی۔

یہاں تو کنکریوں کی ڈھیر [illegible] پڑا ہے [illegible]

نہیں یہ صرف [illegible] نہیں کہ شاید سڑک [illegible] ہو [illegible] پھر یہاں جگہ کہاں ہے سڑک کی تارکول [illegible] راستے اور کچھ [illegible] تو نظر آتا نہیں۔ شاید یہ سامنے کا خلا ان عمارتوں کے درمیان یہاں کچھ نظر نہیں آتا۔

اگرچہ کتے کو وہ پتھر نہیں لگا پھر بھی وہ اپنی دم [illegible] اٹھا کر بھونکتا چلا گیا بھاگ گیا [illegible] اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔

[illegible] رہا ہے [illegible] چیخ رہا ہے۔ [illegible] یا [illegible] ہنسی کی آواز ہے [illegible] سے ابھر رہی ہے۔ آواز سے آواز نکلی ہے اگر کبھی واسطہ کے [illegible] بعد یہ آواز نہ نکلی تو گھڑیال کی بازگشت بھی مجھے لیکن بازگشت کا حلقہ تو میرے گرد اور بھی تنگ ہو گیا ہے۔ اس حلقے کی [illegible] دیوار ساکت ہے اور پچھلی دیوار مجھے اس جگہ کی طرف دھکیل رہی ہے۔ جہاں جہاں اس نے اپنی جیب میں ماچس ڈھونڈی اور پھر [illegible] سگریٹ کی ڈبیا جیب میں ڈالتے ہوئے ماچس کو [illegible] کی طرف نکالا ———

سگریٹ ابھی تک سلگ رہا ہے ——— نہیں ——— نہیں ———

اس نے فوراً اپنی جیب سے ہاتھ نکال لیا۔

میں اس سگریٹ سے اپنا سگریٹ نہیں سلگاؤں گا۔ اور گاڑی ہے بھی اس طرف نہیں دیکھوں گا۔ میں اس جگہ کے کس قدر قریب آگیا ہوں۔ جہاں شہر ایک طرف کو یوں لٹک جاتا ہے، جیسے جیسے افوہ میں یہاں سے اٹھ کیوں نہیں جاتا۔ میں یہاں سے کیوں جاؤں کیسے جاؤں۔ یہ میرا شہر ہے یہ میرا گھر ہے۔ میرا گھر نہیں میری رہائش گاہ

"گھر"

لفظ آواز یہ آواز میرے غم کی آواز ہے۔ اس لفظ کی ادائیگی میں میرا دکھ ہے۔ میں احمق بچہ ہوں اپنے ٹوٹے ہوئے کھلونے سے میں نے اپنا دکھ وابستہ کیا ہے۔ اور اب یہ گھر ثقیل لفظوں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ میری رہائش گاہ۔ میرا شہر۔

نہیں میں اس طرف نہیں دیکھوں گا۔

میرا شہر جہاں میں ہوں اور میرے پیچھے خفیہ پولیس ہے جو ہر قدم پر میرا پیچھا کر رہی ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں میں اپنے لئے رو بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہیں وہ میرے ماتھے پر ریڈ بل چسپاں نہ کر دیں۔ ش ہ اور زین کانٹوں کا تاج میں نے سر پہ پہننے کی بجائے بغل میں چھپا رکھا ہے۔ جسے نکالنے کے لئے وہ شلواروں میں چوہے چھوڑ دیتے ہیں اور پلاس سے ناخن کھینچتے ہیں اور آخر مجھے سانس کیوں نہیں آرہا۔

کنکر اٹھایا اور پوری قوت سے کتے کی طرف پھینکا۔ کنکر سڑک کے کنارے سے ٹکرایا گرد دوسری سمت کو اڑ گیا اور ساتھ ہی اس کی نظریں بھی۔ —

اچھا ہوا [illegible] آ گئے [illegible] کر جاتی۔

یہاں تو کنکریوں کی ڈھیریاں ہی پڑی ہیں۔

نہیں یہ شہر [illegible] تو نہیں کہ [illegible] سڑک [illegible] پھر یہاں جگہ کہاں ہے۔ سڑک کی تاریکی ہیں راستے اور کوئی سامنے تو نظر آتا نہیں۔ شاید یہ سامنے کا خلا ان تاریکیوں کے درمیان نہیں کچھ نظر نہیں آتا۔

اگرچہ کتے کو وہ پتھر نہیں لگا پھر بھی وہ اپنی پچھلی ٹانگ اٹھا کر چیختا چلاتا ہوا بھاگ گیا [illegible] اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔

[illegible] رہا ہے [illegible] چیخ رہا ہے [illegible]

[illegible] اپنی ہنسی کی آواز ہے۔ اندازہ ہر کتے کی چیخوں سے ابھری ہے۔ آواز سے آواز ملی ہے اگر کبھی [illegible] کے بعد یہ آواز نہ نکلی تو گھڑیال کی بازگشت کبھی مجھے لیکن [illegible] بازگشت کا حلقہ تو میرے گرد اور بھی تنگ ہو گیا ہے۔ اس سڑک کی [illegible] کی دیوار ساکت ہے اور پچھلی دیوار مجھے اس جگہ کی طرف دھکیل رہی ہے۔ جہاں جہاں اس نے اپنی چیخوں میں [illegible] اور [illegible] سگریٹ کی ڈبیا جیب میں ڈالتے ہوئے [illegible] کی طرف دیکھا ———

سگریٹ ابھی تک [illegible] ہے ——— نہیں ——— نہیں ———

اس نے فوراً اپنی جیب سے ہاتھ نکال لیا۔

میں اس سگریٹ سے اپنا سگریٹ نہیں سلگاؤں گا۔ اور کافی ہاؤس کی اس طرف نہیں دیکھوں گا۔ میں اس جگہ کے کس قدر قریب آگیا ہوں۔ جہاں سر ایک طرف کو یوں لٹک جاتا ہے، جیسے جیسے اُفوہ میں یہاں سے اٹھ کیوں نہیں جاتا۔ میں یہاں سے کیوں جاؤں، کیسے جاؤں ... میرا شہر ہے یہ میرا گھر ہے۔ میرا گھر نہیں میری رہائش گاہ

"گھر"

لفظ آواز، یہ آواز میرے غم کی آواز ہے۔ اس لفظ کی ادائیگی میں میرا دکھ ہے۔ میں احمق بچہ ہوں اپنے ٹوٹے ہوئے کھلونے سے میں نے اپنا دکھ وابستہ کیا ہے۔ اور اب یہ گھر تین لفظوں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ میری رہائش گاہ۔ میرا شہر۔

نہیں میں اس طرف نہیں دیکھوں گا۔

میرا شہر میں ہوں اور میرے پیچھے خفیہ پولیس ہے جو آٹھ پہر میرا پیچھا کر رہی ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں میں اپنے لئے سو بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہیں وہ میرے ماتھے پر بدل چسپاں نہ کردیں۔ ش ہ اور ران تین کا تتوں کا تاج میں لے سر پہ پہننے کی بجائے بغل میں چھپا رکھا ہے۔ جسے نکالنے کے لئے وہ شلواروں میں چوہے چھوڑ دیتے ہیں اور پلاس سے ناخن کھینچتے ہیں اور آخر مجھے سانس کیوں نہیں آرہا۔

نی اور روشنیاں جگمگاتی ہیں اور تاریک چوکھٹوں میں فریم شدہ رانوں کے درمیان دم توڑ دیتی ہیں۔ شام رات آئی۔ رات آئی اور بھنگی، چرسی، افیمی شرابی۔ کاکروچوں کی طرح اندھیرے میں نکلتے ہیں اور روشنی میں آتے ہی پھر غایب ہو جاتے ہیں، لوگ اتنے سارے لوگ سب کے سب اپنے اپنے ہونٹ چوستے ہوئے رونے کی کوشش کرتے ہیں اور تنہا بستروں میں جا کر ایکسٹرسوں کے ساتھ ہمبستری کرتے ہیں۔

اوگاڈ یہ تیرے کانٹوں کا تاج ہے اور میرا دم گھٹ رہا ہے۔

میرے سامنے یہ تاج نوجوان چہرے کی ہڈیوں میں پگھل گیا ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے گالوں پر فٹ پاتھ پر لکیریں اور منہ میں بھو کی خاموشی کا پتھر اگر میں نے منہ سے کوئی لفظ نکالا تو یہ پتھر بن کر ہر سر کو زخمی کرے گا۔ لیکن میں سقراط ہوں اور میرا دل اس وقت صاف خولی پیپ کرے گا جب میرے سیلز مین ان سڑکوں پہ مجھے سلام کرنا چھوڑ دیں گے۔ کمبختوں نے مجھے پوا سپر کر دی ہے۔

لاحول ولا اتنی لمبی سوچ اتنی خود کلامی نہیں۔ اب میں کچھ نہیں سوچوں گا۔ ہوں تو وہاں سامنے اور نیچے جب بھی میری آنکھیں سیاہی کے چوتڑے سے اترتی ہیں تو میرے ذہن کو کون سی لفظیں دے دیتی ہیں اور یہ کان میرے خیالوں کی آواز کو گھڑیال کی بازگشت کے دانتوں میں کیوں دے دیتے ہیں۔

اس نے فٹ پاتھ پر بیٹھتے بیٹھتے سر کے جھٹکے سے اپنے ہر خیال کو

میں سخت بور ہو گیا ہوں۔ یہاں بیٹھے بیٹھے بیزار ہو گیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا۔ لیکن مجھے ہر رات کی طرح ان ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی سڑکوں ہی سے کسی ایک کے گھر جانا ہوگا۔ مجھے اب اٹھنا چاہیئے۔ لیکن لیکن یہ وقت کا حلقہ مجھے نکلنے بھی تو دے۔ مجھے سگریٹ کی سخت طلب ہے۔ اب مجھے اس سگریٹ سے اپنا سگریٹ سلگا لینا چاہیئے یہ کیا یہ یہ یہ چاک سے بنا چہرے کا خاکہ روشن کیوں ہو گیا ہے اوہ نو۔

اس نے وہاں سے اپنی نظریں ہٹانا چاہیں، پر جیسے وہ روشنی کا حصہ بنیں۔ حلقے کی پچھلی دیوار اسے اور بھی تیزی سے اسے اس چبوترے کی طرف دھکیلنے لگی۔ اس نے فٹ پاتھ سے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا۔

میں اسے کچل دونگا۔ ریزہ ریزہ کر دوں گا۔

اور بڑی تیزی سے چبوترے کی طرف بڑھا۔ چبوترے پر چڑھتے ہی اس کے ہاتھ سے پتھر چھوٹ کر چبوترے پر جا گرا۔۔۔ "روشنی" وہ چیخا۔ روشنی میں اتنی روشنی میں اندھا کیوں ہو گیا ہوں۔

"روشنی۔" اس نے پھر چیخ کر کہا اور اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ "روشنی" اس نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کشکول بنایا اور آسمان کی طرف بڑھایا۔

تم نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ کیوں کیوں چھین لیا کہ میں اپنے بستر میں سکون کا ایک سانس آخری سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اور میں بینائی کھو کر کھردری سڑکوں کی اس صلیب پر لٹکے ہوئے سر کو ٹٹول رہا ہوں۔ میرے دماغ۔ میرے دل۔ میرے ہاتھوں کو دیکھو۔ مجھے وہ چیز دے دو

ساختہ اسے پینٹ ہوا میں پھینک دیا۔

جاؤ سالگرہ بھی اور مجھے خوش رہنے دو۔

اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر سگریٹ نکالنے کے لئے پھر جیب میں چلا گیا اس کی آنکھیں پھر اس جگہ کی طرف اٹھ گئیں، جہاں!

اور خدایا یک کیا سگریٹ تو خیر جل ہی رہا ہے، یہ سگریٹ کے گرد چہرے کا خاکہ، کس نے بنایا ایک طرف کو جھکے ہوئے سر کا خاکہ نہیں نہیں یہ پہلے ہی سے بنا ہوگا۔ کسی شرارتی بچے نے سکول سے لوٹتے وقت کلاس روم سے چرائے ہوئے چاک سے دیوار پر گالی نہ لکھی تو بیہودہ سے پر یہ چہرہ بنا دیا۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیل گئے۔

ہاں تو میں پھر کچھ سوچنا چاہتا ہوں —— نہیں میں کچھ نہیں سوچوں گا دور وہی دو سائے کھمبے کی تاریکی سے نکل کر اب آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ دو ایک بار اس کی حد نگاہ میں آئے بھی تھے۔ لیکن جانے کیوں اس نے ان پر غور نہیں کیا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج کی فلم میں ہیروئن نے کپڑے اتار—— تھے تو اسے ننگا بین جیسے سینے اور گدرے گدرے جسم کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ اسے ان سایوں کے قدموں کی چاپ سنائی تو دیتی تھی۔ لیکن اس نے اس منظر کی بیک گراؤنڈ موسیقی پر بھی تو غور نہیں کیا تھا۔

نہیں میں کچھ نہیں سوچوں گا۔

اس نے سوچا۔

مجھے اپنا ہاتھ دے دو —————— دو اور مجھے میرے گھر لے جاؤ۔ محفوظ جگہ لے جاؤ۔ میرے سر پر تین کانٹوں کا تاج ہے۔ میں بہت تھک گیا ہوں، تنگ آ گیا ہوں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے راستہ دکھا دو آئندہ میں اس جگہ کبھی نہیں آؤں گا۔ کبھی نہیں۔

اس کی نظریں آسمان میں گڑی تھیں۔ اس کے چہرے پر کرب تھا۔ التجا تھی۔

مجھے اپنا ہاتھ دو۔ نہیں؟ —— اچھا۔

اس کا چہرہ یک لخت درشت ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھ گرا دیئے۔

نہیں اچھا تو نہ سہی۔

اس نے بڑے غصے میں اپنے ہاتھوں میں دیکھا۔

تم اوپر کیوں اٹھے تھے۔ کیوں کیوں کیوں ہاں۔ تمہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔

اس نے چبوترے پر پڑا پتھر اٹھایا اور زور زور سے اپنے دوسرے ہاتھ پر مارنے لگا۔

میں اب کیل ٹھونک کر تمہیں یہاں لٹکا دوں گا۔ غدار کہیں کے۔

اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ "ارے باؤ جی —— یہ کیا کر رہے ہو۔؟"

اس نے خالی آنکھوں سے دیکھا۔ وہیں دو آدمی کھڑے تھے۔

"پہلے تو تم نے یہ اوپر والی بتی اتارنے کی کوشش کی ـــــ"

"جی ــــ اوپر والی بتی ـــ سیڑھی کے بغیر تو وہاں ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔" ـــ اس نے حیرانی سے کہا۔

"اور پھر تم یہ چبوترہ توڑنے لگے۔"

"چبوترہ ؟"

"تم کون ہو باؤجی ؟"

"ہیں ـــــ" اس کی سمجھ میں نہ آیا ـــــ وہ دونوں کیا کہہ رہے ہیں

"شرابی معلوم ہوتا ہے۔"

"بو تو نہیں آ رہی ـــــ" دوسرے نے کہا۔

"بکو مت ـــ بو کا آنا ضروری نہیں۔" پہلے نے اپنے ساتھی کو جھڑکا دیا۔

"ہاں ہاں ـــ میرا مطلب ہے کہ بالکل شرابی۔ چلو باؤ ہمارے ساتھ ذرا تھانے تک ـــــ"

"بھائی میں شریف آدمی ہوں ـــــ میں ـــــ"

"شریف آدمی رات کے ڈیڑھ بجے شراب پی کر سڑک پر نہیں پڑے پھرتے۔"

"ارے چلو جی تھانے۔"

"مگر سنتری جی ـــ"

"ہم نے ابھی ابھی تمہیں خود دیکھا ہے کہ تم پہلے فٹ پاتھ پر بیٹھے تھے۔ پھر لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے اور اس چبوترے سے ـــ"

"ہم پیسے ہوتے تو نہیں — میں تو سینما دیکھ کر آرہا ہوں یہ ٹکٹ۔
اس نے جیبوں میں ٹکٹ تلاش کرنا چاہا۔ وہ دونوں ہنسے۔
"کہاں سے نکلے گا ٹکٹ بابو —"
"اللہ کی قسم سنتری جی — میں سینما دیکھ کر آرہا ہوں۔ کون سی
وہ فلم — وہ جس میں ہیروئن کپڑے اتارتی ہے۔"
"دیکھا — مجھے یقین تھا یہ پیئے ہوئے ہے۔" "سچ سنتری جی
"تمہارا گھر کہاں ہے" "میرا گھر — میرا گھر یہیں ہے۔ یہاں کہیں —"
"وہ ہنسا — تو تم اس وقت اپنے گھر میں کیوں نہیں —"
میری مرضی — نہیں — میرا مطلب ہے کہ — گھر میں سب
کی آپس میں لڑائی ہے — اور میرا وہاں دم گھٹتا ہے۔ وہ کہتے ہیں
مجھے جنون ہے۔ پھر جب وہ لڑ لڑ کے تھک کے سو جاتے ہیں تو میں"
ایک نے اسے بازو سے پکڑا۔ "چلو جی بکتا ہے سالا"
دوسرے نے چھڑایا "اچھا بابو تم کام کیا کرتے ہو —؟"
کام کی تلاش — اب میں تمہیں کیا بتاؤں — اس وقت میری پرابلم یہ ہے کہ میں اپنے
گھر کیوں نہ جاؤں جب میں ان سے لڑ کر — جاتا ہوا تو پھر اس رہائش گاہ پر پہنچ جاتا ہوں جو یہ ہے۔
"اچھا چلو — اس بکواس کو چھوڑو۔ تمہاری جیب میں کیا ہے" — دونوں نے اس
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اس نے بغیر کچھ کہے آہستہ آہستہ جیب سے دو روپے
نکال کر ان کے حوالے کر دیے۔ وہ دونوں مسکراتے ہوئے چپ چاپ چلے گئے۔ پیچھے کہیں سے اپنا
دوسرا ہاتھ گیلا گیلا محسوس ہوا اس نے اپنا ہاتھ دیکھا خون میں لت پت تھا۔ اس نے خون
سونگھا پھر چکھا —

ذائقہ بُرا نہیں۔ مجھے ہو کیا گیا تھا آں وہ بازگشت کہاں گئی وہ درد تھا
کیا؟ نہ بال، یہ گھر والے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ میں کچھ
کچھ پاگل ہوتا جا رہا ہوں یعنی اپنے شہر میں کھو جاتا۔

اس نے وہیں چبوترے کے قریب کھڑے ہو کر جیب سے سگریٹ
نکال کر ہونٹوں میں رکھی اور

ہے نا پاگل پن کہ گھر کا راستہ بھول گیا ان سڑکوں کی بھول بھلیوں میں کھو
گیا

چبوترے پر جھک کر اس سگریٹ کے آخری حصے سے اپنا سگریٹ سلگانے
لگا جو کار میں سے کسی نے پھینکا تھا۔

"اب سمجھ کر رہتے ہو، باؤ ناشاد ہو۔" جاتے جاتے ان دونوں
میں سے ایک نے آواز کسا۔

وہ مسکرا دیا۔ اس نے اپنا زخمی ہاتھ پیٹا اور اس طرف دیکھا جہاں
بڑا سا اندھیرا تھا۔ جہاں بھی پھندے لگے پہلے اس کا خیال تھا کہ یہ کنکریاں
اس لئے پڑی ہیں کہ نئی سڑک تعمیر ہو گی۔

رات تو اپنی ہے ہی، چلو یہ راستہ دریافت کریں شاید گھر تک ۔

۱۳

میں امپلائمنٹ ایکسچینج کے سامنے سر جھکائے لوگوں کی قطار میں کھڑا ہوں
سب سے اگلے آدمی کی رفتار سے ... کر سب سے پچھلے آدمی کی پیٹھ تک
ایک سرنگ بنی ہوئی ہے ... سرنگ میں ... رینگ رہے ہیں
میں سرنگ کی دیواروں کو توڑتا، ٹھوکریں کھاتا دفتر کی کھڑکی تک پہنچا ہوں
امپلائمنٹ ایکسچینج کے کلرک نے ایک کاغذ تہہ کر کے میرے ہاتھ میں تھما دیا ہے
اس کاغذ میں وہ تمام سوالات ہیں جن کے لئے تمہیں زندہ رہنا چاہیے اور اس نے
نفرت تان کر میرے سر پر مارا ہے۔ میں خوشی خوشی کاغذ کی تہیں کھولتا ہوں
کاغذ بالکل صاف ہے۔

ٹھک ٹھک، ٹھک... ابھی دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی تھی۔ میں نے
کتاب سے نظریں اٹھائی ہیں اور کسی کو ... سامنے ... کھڑا دیکھ رہا
ہوں کہتا ہے میرا میٹر بند کرنے آیا ہے ... کہ ... بل ادا نہیں ...

کرنوں کے جال میں میں پھنسا ہوں۔ میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ میرے گھر میں بجلی نہیں ہے۔ اگر کسی زمانے میں تھی تو محکمے والے بل کی عدم ادائگی کے باعث کاٹ کر لے گئے ہیں۔ وہ اپنا غار سامنہ پھاڑے ہنس رہا ہے۔ اس کے لمبے لمبے گوشت خور دانتوں سے مجھے کوئی خوف نہیں آیا۔ اس نے ہوا میں پکڑا ہے ان پنج سے ہوا کو کھٹکھٹایا ہے۔

ٹھک ٹھک ٹھک۔ میرے سر میں دستک ہوتی ہے۔

وہ کھڑا رہے گا اور میری آنکھیں اطمینان سے کتاب کے الفاظ چنتی رہیں گی۔ کیوں کہ میرا ٹھور ٹھکانہ تہ خانے میں ہے۔

یہ تہ خانہ کہاں ہے ؟

جانے میں اس کوٹھڑی میں کب سے ہوں۔ خستہ دیواریں کونوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مکڑی کے جالوں سے بندھی ہیں۔ ہر لحظہ یوں لگتا ہے۔ جیسے جالوں کی گرہیں کھل جائیں گی۔ کوٹھڑی میں کوئی روشنی نہیں۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔ مکڑیوں کی آنکھیں بلب ہیں اور میری آنکھیں روشنی۔ جانے ہم کب سے ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہے ہیں؟ کبھی کبھی یہ سوال دندنا کر میرے سر میں دھڑکنے لگتا ہے۔)

میں گھر سے نکل آیا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں دن نکل آیا ہے۔ روشنی اتنی تیز ہے کہ کائنات سورج کا عکس پڑنے سے سیاہ ہو گئی ہے۔ میرے جوتے پکی گلی کی پکی اینٹوں سے زیر لب سازش کر رہے ہیں۔ میرے پیر اس سازش کا شکار ہو رہے ہیں اور میرے سر کی طرح دکھنے لگے ہیں۔ سر اور پیر کے درمیان

مکڑیاں کے جالے ہیں، لانغمہ اور پلاٹینم کے تارہ۔

(پیارے بچو، خوش آمدید!)

انہوں نے مجھے گھر سے نکلتے دیکھ لیا ہے، اور مختلف آوازیں کستے ہیں
میں مسکرایا ہوں اور میری ساری مسکراہٹ ہونٹوں کہ میرے ہونٹوں سے بہہ نکلی
ہے۔ آج ان کا نشانہ صحیح لگا ہے۔ ان کی ہنسی نے مجھے دھکا دیا ہے، اینٹوں
اور جوتوں کے درمیان اُلٹے ٹیپ ریکارڈر چلنے لگے ہیں۔

(خدا حافظ، پیارے بڈھے۔)

ان میں سے ایک نے بڑی تیزی سے میری طرف دیکھا ہے اور میری
نظریں فوراً اپنے ہاتھ کی طرف اٹھ گئی ہیں۔ چھوٹا سا، پیارا پیارا۔ نرم نرم اس
ہاتھ میں پتھر ہے۔

میں چلتی بس میں چڑھتا ہوں جو بس سٹاپ پہ آ کے رُکی تھی۔ کھڑکیوں میں مکان
بجلی کے کھمبے، لوگ، درخت، بھاگے جا رہے ہیں۔ میں ساکت ہوں، بالکل
ساکت۔ بس کی سیٹوں پر صرف میری نگاہ کے دھبے ناچ رہے ہیں۔

گڑبڑ گڑبڑ، بس رُکتی نہیں، چلتی جا رہی ہے۔ لیکن مجھے اترنا یہاں تھا، اوہ
ہاں، اچھا نہیں، اگلے سٹاپ پر سہی۔ اچھا تو پھر اگلا سہی۔

ایک جھٹکے کے ساتھ بس اچانک رک گئی ہے میں نے کنڈکٹر کو تلاش کرنا چاہا ہے تاکہ اسے
ٹکٹ کے پیسے دے دوں لیکن بس میں کوئی نہیں۔ مسافر، کنڈکٹر نہ ڈرائیور۔ یہ ڈرائیور کہاں
چلا گیا میں نے بس سے اتر کر ڈرائیور کو تلاش کرنا چاہا ہے۔ لیکن بس بیابان کی خاموشی کا حصہ
ہے۔ جانے کون سی جگہ ہے۔ مجھے واپس چلنا چاہیے۔ میں خود بس سٹارٹ کرنے کی کوشش
کرتا ہوں، خاموشی۔ انجن میں شاید کوئی خرابی ہو گئی ہے۔ میں نے اتر کے بونٹ اٹھا

کرا نچن میں بچھا نما ہے، پنکھے کے پٹے میں میرا شعر چھپتا ہوا ہے۔

(ماتھے پر لکھا ہے۔ ڈرائیور)

موم بتی روشن ہے، سب سے باہر نیلا حلقہ، پھر نارنجی، پھر پیلا اور درمیان میں سیاہ تنکہ۔ شعلہ منجمد ہے، جانے کہاں سے ایک پروانہ یہ شعلہ چوری کرنے آیا ہے۔ اس نے خاموشی سے غوطہ لگایا ہے، چور کا جال [illegible] ہی کر آسمان کو اٹھا ہے، وہ ایک اور آیا۔ ایک اور، ایک اور۔

موم، مشں روم کے ستونوں میں چنی گئی ہے، اور ساتھ ہی یہ منجمد نیلے نارنجی اور پیلے حلقے۔ لیکن سیاہ تنکہ پتھر ہے۔ اور میں اس پتھر کے آئینے میں محفوظ ہوں۔

بہت تیز قسم کی بدبو ہے۔ ایلومینیا اور انتڑیوں کے پاس سے ای کولائی فضا پر چھا گئے ہیں۔ گودام میں اگر گوشت اور انسانوں کی زندگی اور موت گڈمڈ ہو گئی ہے۔ ای کولائی میں زندگی ہے۔ اور یہ زندگی گودام کی موت، فرش پر کاک روچوں کی لاتعداد فوجیں گامزن ہیں۔

یہ بدبو کہاں سے آ رہی ہے۔

چند کاک روچ اپنی صفیں چھوڑ کر مجھ پہ حملہ آور ہو گئے۔ ان کے جسموں سے ننگی آریاں اور خاردار منہ میرے پیروں پہ چل رہے ہیں۔ پیر سے پیروں کا دور سفر کرتا گھٹنوں تک آ گیا ہے۔ [illegible] گئے ہیں، مجھے [illegible] آ رہی ہے کہ [illegible] مجھ سے [illegible] آ

نہم کی رات

میں وہ بدبو ہوں جو اس شخص کے اندر جذب ہو رہی ہے جو کاکروچوں پر ہنس رہا ہے ـــــ یا وہ شخص ہوں جو کاکروچوں کے پیر چاٹ رہا ہے۔

میرے سینے سے الٹی گری لاتعداد ٹانگوں والا فل بوٹ اٹھا لو۔ مجھے سانس لینے میں تکلیف ہوتی ہے

خوردبینی خلیوں سے بنے چھوٹے چھوٹے جھنڈے سات رنگوں کا چشمہ ہیں دھنک پگھل کر سرخ ہو گئی ہے اور بہہ نکلی ہے، لہو کے پہلے قدم جمتے جاتے ہیں۔ دوسرے قدم اوپر سے پھسل کر پہلے بن جاتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان قدموں میں میرے قدم بھی ہیں، میں اس دریا پر پکنک منانے آیا تھا) دریا میرے گرد ایک بہت بڑی قوس میں گھوم کے دائرہ بن گیا ہے۔ میں اس سرخ سانپوں کی کنڈلی میں قید ہو گیا ہوں۔ کنڈلی کے وسط میں بیٹھا خوردبین سے رومال کے خلیوں میں فرار کی راہ ڈھونڈ رہا ہوں، خوردبین کی آنکھ سے لاتعداد آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔

ہر آنکھ میری آنکھ ہے، میں کس راہ سے نکلوں۔؟

دیکھو میں کونے کے سرے کا چنا ہوا اور قیمتی پتھر رکھتا ہوں، جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا یا ٹھیس لگنے کا پتھر ٹھوکر کھانے کی چٹان ہوا، کیوں کہ وہ نافرمان ہوئے۔)

پتھروں پر میرا نام کندہ ہے اور میں نے ہی پتھروں کے تخت پر بیٹھے شخص کے ہاتھ میں وہ کتاب دیکھی جو کہ اندر سے اور باہر سے لکھی ہوئی تھی اور جسے مہروں

لگا کر بند کیا گیا تھا۔

کون ان مہروں کو توڑنے کے لائق ہے —— میں نہیں ——

کون ان مہروں کو توڑنے کے لائق ہے —— میں ہوں۔ ——

میرے سر میں مہرے توڑنے کی آوازوں سے کنکھجورے رینگ رہے ہیں۔

سیاہی مائل سبز رنگ پیروں کے راستے ٹانگوں میں سفر کرتا ہوا میری گردن تک آپہنچا ہے۔ پلاٹینم کے تار بجھ گئے ہیں اسرار پیروں کے درمیان لکڑی کے جالوں میں لفظ مصلوب ہے۔ اس کی بوندیں خاردار تاروں سے ٹپکتی ٹپکتی اٹک گئی ہیں، لاتعداد چیونٹیاں بوندوں کا رس چوس کر لوٹتی ہیں پیاسی چیونٹیوں کے کانوں میں سرگوشی کرتی ہیں اور کھلکھلاتی آگے بڑھ جاتی ہیں (ان کی کھلکھلاہٹ سے میرے گوشت کی دیوار پر گدگدی ہوتی ہے)۔

میرے جسم کے تین چوتھائی حصے ہیں جو کہ پانی ہے بلبلے پھوٹ کر ہنس رہے ہیں۔ ان کے متعفن بھبکوں سے میرا سر چکرا رہا ہے۔ مجھے متلی ہو رہی ہے۔ ایک ایک ریشہ تن رہا ہے۔ ڈھیلا ہو رہا ہے اس لفظ کے آخری سانس کیوں ختم نہیں ہونے۔ ایک لمحہ بس ایک لمحہ۔

یہ لمحہ پھیل کر ابدی ہو گیا ہے۔

مجھے لطف آنے لگا ہے۔

"یہ نالی میں اوندھا پڑا تھا۔"

(یہ غلط کہتا ہے میں تازہ پھلوں کے تخت پر بیٹھا تھا)

"یہ لاوارث ہے۔ ہم اسے آپ کے پاس لے آئے ہیں"

(ہا ہا ہا ہا ہا) جاہل ۔

اس پہ جھٹکے کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا ۔ میں نے اس کے لعاب دار گوشت کو خوردبین سے دیکھا ہے جو تصدیق کرتا ہے کہ اس کو پیروں سے لے گردن تک زہر برباد ہو گیا ہے ۔ اس کے سر کو بچانے کے لئے اسے جسم سے علیحدہ کرنا ضروری ہے ۔

"لیکن ڈاکٹر مجھے کوئی تکلیف نہیں"

"نہیں تمہیں تکلیف ہے"

"نہیں"

"بیوقوف ۔ مجھے تم سے زیادہ علم ہے ۔ سر کو بچانا پڑے گا ۔"

"قتل ہونے میں بڑی لذت ہے ۔"

گائے

ایک روز انہوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ اب گائے کو بوچڑ خانے میں دے ہی دیا جائے۔

"اب اس کا دھیلا نہیں رہا" ان میں سے ایک نے کہا تھا "ان مٹھی بھر ہڈیوں کو کون خریدے گا۔"

لیکن بابا۔ مجھے اب بھی یقین ہے۔ اگر اس کا علاج باقاعدگی سے۔

"تم چپ رہو جی بڑے آئے عقل والے۔"

ننکا چپ کر کے ایک طرف ہو گیا تھا اور بابا اپنی داڑھی میں عقل کو کریدتا ہوا اس کے بڑوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں جب زبان ہلاتا ہوں تو یہ بوچڑ بن جاتے ہیں۔ یہ رشتہ میں نے اپنی کو پہچانا ہے، اسی روز سے جنگبری کو بھی جانا ہے، اور جس دن سے یہ لوگ اسے بوچڑ خانے

لے جانے کی سوچ رہے ہیں، اس دن سے میں ہر لمحہ مغموم ہوتا ہوں، یتیم ہوتا ہوں، میں کیا کروں، یہ سب مجھ پر ہنستے ہیں کہ میں اس کی اتنی خدمت کیوں کرتا ہوں۔ ان ہڈیوں سے اتنا پیار کیوں کرتا ہوں۔ کیوں کرتا ہوں۔

آپ اسے بوچڑ خانے کے بجائے ہسپتال کیوں نہیں بھیج دیتے۔

نکلتے سے رہا نہیں جاتا تھا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاج پر پیسہ خواہ مخواہ کیوں برباد کیا جائے"

میں ناسمجھ ہوں ابھی تو کل ہی ماں نے دھاگے میں پندرھویں گرہ لگائی ہے۔

"آپ علاج کرا کے دیکھیں تو سہی"

"بڑوں کی باتوں میں دخل نہ دیا کرو"

میرا جی چاہتا ہے کہ میں کہ میں آپ سب کو بوچڑ خانے دے آؤں۔

پھر سب نے مل کر گائے کی زنجیر پکڑی تھی، لیکن جیسے گائے کو بھی سب کچھ معلوم تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی تھی۔ انہوں نے مار مار کے اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ ننکا ایک طرف کھڑا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شاباش میری چتکبری، میری گائے۔ میری گئو ماتا، ہلنا نہیں۔ تم نہیں جانتیں، یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں، جانا نہیں، ہلنا نہیں ورنہ، ورنہ —— نہیں تو ——

گائے اپنی جگہ پہ اڑی، مڑ مڑ کے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ ذرا ہٹ کر گائے کا بچھڑا کھونٹے کے ساتھ رسی سے بندھا بے تعلق بیٹھا تھا

ہڈیوں پہ لاٹھیوں کی بوچھاڑ اسے نہیں سنائی دے رہی تھی۔ بکتے کے کان بھی
بند ہو رہے تھے ——— رفتہ رفتہ ———

سارے بزرگ ہانپتے ہوئے پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ پھر فیصلہ
ہوا تھا۔ کہ اگر یہ اب چل بھی پڑے تو ممکن ہے راستے میں کھمبا ہو جائے
اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے ٹرک میں ڈال کر لے جایا جائے۔ ٹرک میں
تو اسے اٹھا کر بھی لادا جا سکتا ہے۔

اگلے روز ٹرک بھی آگیا تھا۔

ٹرک کی آواز پہ گائے نے مڑ کے دیکھا تھا۔ آنکھیں جھپکی تھیں اور پھر
کھرلی میں منہ ڈال دیا تھا۔ جہاں بکا چارہ ڈال کے ابھی ابھی ٹرک کو دیکھنے گیا
تھا۔

"آپ لوگ اسے واقعی ——— اسے یقین نہیں آتا تھا۔

"نہیں تو ہم مذاق کر رہے ہیں کیا۔ ؟" ——— ایک نے کہا تھا۔

"بابا، یہ گائے مجھے دے دو۔ میں اسے ۔

"حکیم کی اولاد" ——— دوسرے نے کہا تھا۔

"بابا اس کے بغیر میں ———"

"مجنوں کا بچہ" ——— تیسرے نے کہا تھا۔

چوتھا پانچواں سارے بزرگ، سارے بزرگ سالے ایک سے ہیں
اور یہ بابا جو اپنی داڑھی کو عقل کا گڑھ سمجھتا ہے۔ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔
بیٹھے: ——— ٹرک والے کو دس روپے دے کر بھی ہم بہت فائدے میں رہیں گے.

او۔ کمبخت سوداگر، مجھ سے روپے لے، مجھ سے یہ لے۔ لیکن میری مٹھی میں اس وقت تو ہوا ہے۔ جب، جب میں بڑا ہو جاؤں گا ـــــــ

ہا ہا ہا ہا ـــــــ

جب، جب میں کمانے لگوں گا ـــــــ

ہا۔ ہا۔ ہا ہا۔

تب تب تک تو چکبری کی ہڈیوں کا سُرمہ بن گیا ہوگا۔ میں میں کیا کروں

ان میں سے ایک، گائے کو لانے کے لئے کھرلی کی طرف گیا تھا۔ نکا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا تھا۔ یونہی دیکھنے کے لئے۔ بڑے نے اس کی زنجیر کھولی تھی۔ گائے نے کھرلی میں منہ مار کے دانتوں میں بھٹے دبائے تھے مڑ کے نکے کو دیکھا تھا اور جانے کے لئے کھر اٹھایا تھا۔

"نہ ۔ نہ ۔ نہ" نکا چیخا تھا۔

"بکو مت"

گائے کھڑی ہو گئی تھی۔

"ہٹ ہٹ ہے" بڑے نے زور لگایا تھا۔

"نہ چتکبری ... نہ ـــــ نہ گنوا نا ــــ نہ"

"چپ بھی کرو گے یا کھینچوں تمہاری زبان"

نکے نے زبان کو قید کر دیا تھا۔ بڑے نے پھر زنجیر کو جھٹکا دیا تھا۔ "چلو ہم صاحب! ٹرک والا تمہارے باپ کا نوکر نہیں جو سارا دن کھڑا رہے"

گائے کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ زبان، قید میں پھڑ پھڑا کے رہ

گئی تھی۔ لیکن وہ مشت استخواں وہیں کی وہیں تھی۔ نکا مسکرایا۔ پھر فوراً ہی اداس ہو گیا تھا۔

یہ تو یہ تو بک بھی چکی ہے۔ اسے جانا ہی ہو گا۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ اگر تھوڑی سی رقم لگا کے اس کا علاج باقاعدگی سے کیا جائے، تو تو لیکن میں ان بزرگوں کا کیا کروں، کاش میں حکیم ہی ہوتا۔ اس بچھڑے کو شرم نہیں آئی، ماں کے جسم پہ نیل پڑ رہے ہیں اور یہ باہر کھڑا الو کے پٹھوں کی طرح دیکھے جا رہا ہے۔

زبان پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔

پھر ان میں سے ایک کو بڑی اچھی سوجھی تھی۔ اس نے گائے کی دم پکڑ کر اسے تین چار بل دیئے تھے۔ وہ پیٹھ کے درد سے دور بھاگی تھی۔ اس نے نکے کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا تھا۔ پیٹھ کا درد گائے کو اٹھا ہوا بالکل ٹرک کے پاس لے آیا تھا۔ نکے کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

در فٹے منہ، لعنت لکھ لعنت ——

ٹرک والے نے گائے کے چڑھنے کے لئے ٹرک سے زمین پر تختہ لگا دیا تھا۔ گائے نے تختے پر کھر رکھا۔

" نہ چڑھنا۔ "

" اس کی زبان کاٹ دو —— یہ گائے کو ورغلاتا ہے، ڈراتا ہے۔

نکا پھر منہ بند کر کے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ گائے نے پہلے تختے کو دیکھا، پھر نکے کی طرف۔

درفٹے منہ ــــ لعنت ــــ لاکھ لعنت ــــ

نکے کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔ ــــ

اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ کیا کر سکتا ہوں۔

وہ ابھی تک نہیں ڈری تھی۔ پھر اس نے مشکوک نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بڑے زور سے پھنکار ماری تھی۔

میری چتکبری جانتی ہے جانتی ہے کہ وہ "نکے" پر قدم رکھ کر ٹرک میں چلی جائے گی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی کیوں، کیوں، وہ چڑھنا نہیں چاہتی۔ ان سب نے مل کر اس کی پیٹھ پر لاٹھیاں برسائی تھیں، گائے کی ٹانگیں تھرکی تھیں لیکن وہ اپنی جگہ سے قطعی نہیں ہٹی تھی۔ جب انہوں نے مل کر دوسرا وار کیا تو وہ تکلیف سے دوہری ہو گئی تو بہتر کہ بابا کی داڑھی میں عقل نے جوش مارا تھا اور اس نے جا کر اس کے منہ پر لاٹھی ماری تھی۔ گائے پھر "نکے" کی طرف منہ کر کے سیدھی ہو گئی تھی۔ بابا نے ہانپتے ہوئے کہا تھا ــــ "آؤ بیلیو" اور ان سب نے مل کر پھر لاٹھیوں کا مینہ برسایا تھا۔

نکا دور کھڑا تھا۔ بالکل بے تعلق بے حس۔

"یوں بات نہیں بنے گی" ــ ایک نے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔

"تو پھر ؟ ؟"

وہ ٹرک کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ جانے گائے کو کیا سوجھی تھی۔ پلٹ کر یکدم بھاگ اٹھی تھی اور دھول اڑاتی نکے کے

قریب سے بالکل اجنبیوں کی طرح گزر گئی تھی ۔

نکا ـــــ جسم کا مفلوج حصّہ ۔

"دیکھو، دیکھو، وہ تو بائیں طرف ـــــ" ایک چونکا تھا۔

"قدرتی بات ہے" بابا نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

گائے اپنے بچھڑے کو چاٹ رہی تھی۔ بابا کی آنکھیں مکار سی مسکراہٹ سے چمک اٹھیں۔

"اس بچھڑے کو یہاں لے آئے ـــــ یہ چال تو یہیں کل ہی چل جانی چاہیے تھی۔ ٹرک کے پیسے بھی بچ جاتے۔"

نکا ـــــ مفلوج وجود ـــــ

ان میں سے ایک نے بچھڑے کی رسی پکڑی تھی۔ نکے کی زبان لرزی تھی۔ گائے کچھ سوچتی، قدم اٹھاتی، رکتی چلتی بچھڑے کے پیچھے پیچھے اس کے قریب سے گزری تھی تو آہستہ سے نکے کی زبان سے گالی پھسلی تھی۔ بچھڑا، تختے پر چڑھ کے پٹوسیاں مارتا ہوا ٹرک میں چلا گیا تھا۔ گائے تختے کے پاس جاکے پھر رکی تھی۔ بڑی حیرانی سے بچھڑے کو دیکھ کر آہستہ آہستہ گردن موڑ کے نکے کو دیکھا تھا۔ ایک نے فوراً بغل سے پٹوں کا گھٹا نکال کر گائے کے آگے کر دیا تھا۔ اس نے چند ڈنٹھل دانتوں میں لے لیے اور پھر کچھ سوچ کر زمین پر گرا دیئے تھے۔ اور اگلا کھر تختے پر رکھ دیا تھا پھر دوسرا کھر۔

خدا معلوم نکتے کو کیا ہوا تھا۔ یک دم اس کے سارے جسم میں تازہ تازہ گرم گرم لہو کا سیلاب آ گیا تھا۔ اس کے کان سرخ ہو گئے تھے اور دماغ بے طرح بجنے لگا تھا۔ وہ بھاگا بھاگا گھر میں گیا تھا اور بابا کی دونالی بندوق اتار کے اس میں کارتوس بھرے تھے۔ اس جنون میں بھاگتا ہوا باہر آ گیا تھا اور کاندھے پر بندوق رکھ کر نشانہ باندھا تھا۔

اس نے کھلی آنکھ سے دیکھا۔ بچھڑا ٹرک سے باہر گائے کے گرائے ہوئے پٹھوں میں منہ مار رہا تھا۔ ٹرک میں بندھی گائے باہر منہ نکال کر بچھڑے کو دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے ایک گائے کو لے جانے کے لیے ٹرک میں بیٹھا تھا اور بابا ایک ہاتھ سے اپنی داڑھی میں عقل کو سہلاتا ہوا باہر کھڑے ڈرائیور سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا — نکے نے کسے نشانہ بنایا۔ گائے کو، بچھڑے کو، ڈرائیور کو، بابا کو یا اپنے آپ کو —— یا وہ ابھی تک نشانہ باندھے کھڑا ہے۔

کوئی وہاں جا کے دیکھے اور آ کے مجھے بھی بتائے کہ پھر کیا ہوا۔ مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ ایک روز انہوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ۔

کیکر

اس نے گدھے کی پیٹھ سے بالٹیاں اٹھا کر پوری قوت سے پانی بہایا۔

"یہ بھی لو۔ یہ بھی لو۔"

سفید دھول کا غبار اٹھا اور پانی پر جم گیا۔ اس نے اپنے جسم پر آیا ہوا سارا پسینہ دونوں ہاتھوں سے نچوڑ کر زمین پر ٹپکایا اور گدھے کو ہنکاتا کیکر کے درخت کے تلے آ گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

زمین کی زبان پر پھر کانٹے اگ آئے ہیں۔ سارا پانی بھاپ بن کر آسمان پہ چلا گیا ہے۔ ابھی بادل آئیں گے۔ کب بادل آئیں گے کہ چاول بوؤں۔

گدھا زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ جانے اسے کیا سوجھی کہ ہاتھ اور گھٹنے ٹیک کر وہ بھی زبان نکال کر ہانپنے لگا۔ "میں تم ہوں اور تم میں ہوں"

اس نے گدھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرگوشی کی۔ گدھے نے زبان منہ میں ڈال کر بڑی سنجیدگی سے منہ موڑ لیا۔ وہ جھینپ گیا۔ خفت کو مٹانے کے لئے ہنسنے لگا۔ دھیمی دھیمی ہنسی رفتہ رفتہ دیوانہ وار قہقہوں میں ڈھل گئی۔ وہ اٹھا۔

ہا ہا۔
کوئی جواب نہیں

ہا ہا ہا ہا۔
مشرق مغرب، شمال جنوب ہا ہا ہا ہا کوئی نہیں۔ یہاں جو میری ہنسی سن کر انگلی اٹھائے۔ وہ وہ گھر وہ گھروندا وہ گلی سائیں سائیں دور دور صرف ببکر کے درخت ہیں جو میری آواز سن کر جھومتے ہیں اور دھوپ زدہ آسمان پر انگلی اٹھاتے ہیں۔
شکریہ۔

اس کی آنکھیں ببکروں کی سبزی چوس کے پھر گدھے پر آگئیں۔ وہ اس سے اسی طرح منہ موڑے کھڑا تھا۔ اسے گدھے پر غصہ آگیا۔ اس نے اس کے پیٹ پر دو چار مکے رسید کئے۔ اور اس سے ردعمل کی امید میں اسے دیکھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔

گدھا!!! ہا ہا ہا۔
گدھے نے منہ اٹھا کر آنکھیں جھپکیں۔ اس کو دھوپ میں کھڑے دیکھ کر بلغت اسے بڑا ترس آیا۔ اور اسے رسی سے کھینچتا، انجیر کے سامنے ٹیک لگا

کر بیٹھ گیا۔

درخت کے نیچے بھی دھوپ اس کی چھاؤں کہاں گئی ہوں ں ں اس پر کتنے پتے باقی رہ گئے ہیں ——— سورج — انجیر کی خشک بانہیں ——— کاٹ رہی ہیں۔

ایک پتہ نہیں کہاں ہے، ایک دو تین چار۔ ارے یہ درخت تو۔ اس کی آنکھوں میں تیز روشنی کے اندھیرے چھا گئے۔

ہرا بھرا ہے۔ ابھی تو کافی پتے ہیں۔ اتنے کہ درخت کے نیچے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

اس نے اپنی آنکھیں، بلیں، کھولیں، ناچتے ہوئے تارے افق پر جا کر ٹوٹ بہے۔ چمکتی لکیر چھوڑ گئے۔

ہوں دریا آآآآ، مکی جوار، باجرہ۔ میں چاول کیسے بوؤں کہ سونا کا لوٹں دریا آآآ۔

اس نے آہ کو فوراً گلے میں دبا دیا۔

میں آہ کو حلق سے نکلنے نہیں دوں گا۔ کہیں وہ لوگ سن نہ لیں۔ میں ہارا نہیں کیونکہ درخت سبز ہیں، ان کی جڑیں دور دور زمین کی کوکھ تک اتر گئی ہیں کہ یہ سرسبز ہیں۔ میں بھی وہاں ہوں۔ ایک دن ہماری جڑیں زمین کی چھاتیوں سے دودھ گیریں گی۔ لیکن کب کب ان لوگوں کو یہاں سے بھاگے صدیاں بیت گئی ہیں، اور میرا جسم شل ہو گیا ہے۔ میں آہ نہیں بھروں گا۔ کہیں وہ سن نہ لیں، وہ بڈھا نہ سن لے جس نے کہا تھا کہ میں معتوب ہوں

مجرم ہوں اور یہ میری سزا ہے کہ ساری عمر اس قید میں رہوں ۔ میں آہ نہیں بھروں گا کہ یہ راستہ میں نے آپ پسند کیا ہے ۔ دریا سے یہاں تک یہاں سے دریا تک ۔ یہ اسیری میں نے خود چنی ہے اور میں بہت خوش ہوں یہ آہ نہیں نکلنی چاہیئے ۔

اس نے ہاتھ منہ پر رکھ کے چوڑی آنکھوں سے سامنے دیکھا ۔ گرم ہوا گھروندوں کے کھلے دروازوں کو کھٹکھٹاتی تھی ۔ منڈیروں سے گرم خاک اڑاتی تھی ۔

اب وہ بڈھا کمبخت کیا سنے گا ۔ اب وہ تمام سیاہ بخت کیا سنیں گے جنہوں نے اس پکار پر اپنے کان بند کر دیئے ، فرار ہو گئے ۔ سامنے ویرانوں میں بھٹکتے ہوں گے ۔ ہریالی ہو گی کہ پرائے پیروں کو ڈستی ہو گی کہ وہ اپنی خاک کو روند کر آئے ہیں ۔ صرف میں ہوں ۔ کیکر کے درخت یا تم میں ہوں ۔

” سنتے ہو ۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں ہوں ۔ “

اس نے گدھے سے کہا ۔ گدھے نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دانت نکالے ۔ ڈھینچوں کا ارادہ کیا ۔ پھر ملتوی کر کے ہوا میں منہ مارنے لگا ۔

” کہ نہیں ہوں ؟ “

اس نے گدھے کی چپ سے خفا ہو کر پلٹ کر خالی گھروندوں کو دیکھا ۔ پوچھا ۔ سفید مٹی سے بگولے جنم لیتے تھے ۔ اڑتے ہوئے آتے

تھے اور ان گھروندوں کی دہلیزوں پر دم توڑ دیتے تھے ۔ یکلخت گدھے
نے منہ اٹھا کر ایک لمبی ڈھینچوں کی ۔

"چپ کرو گدھے ۔ میں نے سوال کیا ہے" میں نے کس سے پوچھا
ہے ۔

اس کی نظریں گدھے کی چیخ پر سوار ہو کر آسمان پر پہنچ گئیں ۔ چلچلاتی دھوپ نیلاہٹوں کو
سلگتی تھی اور زمین پر سفیدی اگلتی تھی ۔ میں ہوں کہ میری آنکھوں میں کائنات کا
کوئی رنگ نہیں ۔ زمین آسمان ہے ۔ آسمان زمین ، رنگ کی غیر موجودگی
سفیدی ہے ۔ سیاہی ہے اور سیاہی زمین پر سفید داغ ہے ۔

سفیدی ملی مٹی میں اگی خاردار جھاڑیوں سے گرم ہوا الجھتی تھی اور پھر
بگولا بن کر آسمان کو اٹھتی تھی ۔

میں ہوں کہ زمین اور آسمان کے درمیان سفر ہوں ، نہیں ہوں کہ چلتا
ہوا خالی گھروندوں کی دہلیزوں پر دم توڑتا ہوں کہ پھر جنم لیتا ہوں ۔ اور
آسمان کو اٹھتا ہوں کتنا خوبصورت چکر ہے سب بکواس ہے ۔ میرا اس
سے کوئی تعلق نہیں ، میری آنکھوں میں تو کیکر کے درختوں کی سبزی ہے ۔
اور میں اس لئے ہوں کہ زمین کو چاٹتے سفید پھولوں کو دیکھتا ہوں اور ان
سے جنگ کرتا ہوں ۔ میرے جسم پر زبانوں کے زخم ہیں ۔

"بابا یہ کہیں ۔"

اس نے اچانک گدھے سے کچھ کہنا چاہا ۔ گدھا اسی طرح منہ موڑے
کھڑا تھا ۔ اس نے گدھے سے مایوس ہو کر اپنے مکان کی طرف دیکھا ۔ دائیں رد .

دیوار کے سامنے کچھ رقبے میں سبزیاں اگی تھیں اور اس سر سبز رقبے کے وسط میں اس کے باپ اور ماں کی قبریں تھیں اس کے زندہ رہنے کی وجوہ۔

"بابا یہ کہیں تمہارے وجود کا عرق تو نہیں، سفید سفید جو گہرائی سے سطح پر آیا ہے، ماں یہ کہیں تیری چھاتیوں کا دودھ تو نہیں جو مسؤں مٹی تلے سے ابل کے دھرتی کے سینے پر پھول بنا ہے۔

"یہ دھرتی سوتیلی ماں ہے۔ ہمارے لئے اس کی چھاتیوں میں دودھ نہیں۔" سب نے زمین پر سفید سفید داغوں کا سیلاب آتے دیکھ کر کہا تھا۔

"نہیں۔ نہیں۔" اس نے انہیں یقین دلایا تھا۔

"اس کی چھاتیوں کو کوڑھ ہو گیا ہے۔"

"تمہاری ماں پھر بھی ماں ہے۔"

"ہم نے تمہارے کہنے پر اتنے دکھ سہے ہیں۔"

"اب ہم یہاں زندہ نہیں رہ سکتے

"ہم اس پر تھوکتے ہیں"

"تم ماں کے جنے نہیں۔"

وہ ان کے پیروں میں تھوک کر غصے میں کانپتا اپنی کوٹھڑی میں آیا تھا اور کھڑکی سے تھوڑے سے رقبے میں کھڑی فصل میں اپنے ماں باپ کی قبروں کو دیکھنے لگا تھا۔

کیوں ماں کہیں یہ تیری چھاتیوں کا۔

اس کی نظریں قبروں سے پھسل کر سفیدی پر تیرتی افق پہ جا پہنچیں۔

دریا — آ —

اسے دریا کے پانی سے نہلائیں " اس نے سوچا تھا۔ " یہ کوڑھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بارش کا انتظار کرو۔ رحمت کا انتظار کرو۔ "

اس کی نظریں دریا کی لکیر سے اٹھیں۔ آسمان قوس بنا کر حدِ نگاہ پر محیط ہو گیا۔

آسمان یہ آسمان یہ آسمان الٹا لٹکا کنواں ہے۔ جب کبھی کبھی ہنستا ہے تو اس کی ٹھوکروں کی چھینٹوں میں مکّی کی جوار باجرہ باجرہ۔ چاول کیسے بو دُں کر سونا اتاروں۔

" چاول کیسے بوئیں کر سونا اتاریں۔ ہم سب مقروض ہیں مجھے اتنا دینا ہے، اتنا دینا ہے۔ " ایک ایک کر کے سب نے کہا تھا " پانی کا ایک قطرہ نہیں اور یہ چند روز میں زمین کی سفیدی ہمارا کفن ہو گی۔ "

" سنو سب میری بات سنو "

" ہاں بھئی ماں کے جنے کہو۔ "

" دریا اونچائی سے اترتا ہے۔ چلو نالی لگا کر پانی یہاں لے آتے ہیں۔ "

وہ سارے ہنستے تھے . . نالی — احمق یہ کوڑھ اندر سے آیا ہے — پاگل ہی او — پاگل ہی او ئے۔ "

" اس کے پانی میں شغل ہے۔ "

پاگل ہی او ئے، پاگل ہی او ئے۔ ہنستے ہنستے ماں کی کوکھ کو ٹھوکر مار کے پہلے ایک گیا تھا۔ پھر دوسرا۔

"غدار بھگوڑو — تم ذرا سی بات پر قطع تعلق کرنے پر تلے ہو۔"
اس نے گدھے کو ہل میں جوتا تھا اور پاگلوں کی طرح زمین پہ لکیریں
کھودنے لگا تھا۔

"سنو۔ میری بات سنو!"

"ہاں بھئی ماں کے جنے۔ اب کیا کہتے ہو۔"

"یوں کرتے ہیں کہ یہاں انجن لگا کر اس بس کو نکال پھینکیں۔"

"پاگل ای اوئے۔ ہمارا بال بال گروی پڑا ہے۔ ہم خود بک گئے
ہیں۔ اتنی رقم سے کہاں سے لائیں۔"

"ہنہ، انجن لگائیں گے ماں کے یار۔"

"میں شہر جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے۔"

وہ سارے ہنستے تھے — "اگر ہماری آواز ان کانوں تک پہنچ سکتی
تو ہم یہ داغ ابھرنے ہی نہ دیتے۔"

پاگل ای اوئے۔ ہنستے ہنستے ماں کی کوکھ پر ایک اور گیا تھا۔ پھر
ایک اور، باقیوں کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے تھے۔ اس نے سامنے والے
گھر میں پناہ ڈھونڈنا چاہی تھی۔ وہاں بھی لٹکتا ہوا تونگ ماتھے پر پڑ گیا تھا اور
لڑکے والی سہیلی کے باہر صحن میں بکری کے بچے کو سینے سے لگا کر بھک
بھک کر رونے لگی تھی۔

تب کو مذہبی سیتھی جا اٹھ گئے — اس نے بکری کے بچے کی پیٹھ سے اٹھا
کر اسے دیکھا تھا۔

ہمارے مویشی مر رہے ہیں۔ ہمیں بچے پالنا ہیں۔ بیٹیوں کا بیاہ کرنا ہے۔
اس زمین پر بانجھ کا سایہ ہے۔ اور اس زمین کا سایہ ہماری چھاتیوں پر ایڑیاں
مارتے مارتے ہماری ایڑیاں چھل گئی ہیں۔ چشمے کہاں ہیں۔

چشمے کہاں ہیں کہ سفیدی سبز ہو، سبزی سرخ ہو، کنواریوں کے گالوں
میں لالی اترے۔ لونگ والی اپنے لونگ پر گھونگٹ کاڑھے ہے جو کہ اس کی
ماں کی ماں نے، پھر اس کی ماں کی ماں نے جو کہ پہلی ناک سے اس کی ناک تک
پہنچا ہے۔

"شہر سے کب آئیں گے وہ لوگ۔"

اس کے شہر سے لوٹنے پر لڑکی ہر روز اس سے پوچھتی تھی۔

"کب آئیں گے وہ؟ پھر وہ آخری مرتبہ اس سے پوچھنے آئی تھی۔ اس
کے بابا نے کہا تھا کہ آئندہ اگر وہ اس خودسری اور بے ادبی سے ملے
گی تو وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے وہیں پھینک جائے گا۔

"دو ایک دن میں۔"

بڈھے نے کہا تھا اس نے ان سب کو فریب میں رکھا ہے۔ سبز باغ
دکھاتے ہیں۔ دن کو سپنے دیکھنے والا مجرم ہے۔ گردن زدنی ہے۔

"تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے۔"

مجرم سے راہ و رسم رکھنے والا بھی مجرم ہے اگر تم اس سے پھر ملیں
تو تمہاری لاش اس سفید آگ میں جلتی رہے گی۔

"ہاں مجھے یقین ہے۔"

اور یہ کوئی گدھا بھی نہیں ہوگا جو تمہیں اس اذیت سے نجات دلائے۔
"اگر تمہیں یقین ہے تو پھر مجھے بھی یقین ہے۔"

لڑکی نے اطمینان کا سانس لیا تھا اور دبے پاؤں چلتی اپنے گھر کی کھڑکی میں غائب ہو گئی تھی۔

اس نے کھڑکی سے نظریں چرا کر کنکھیوں سے گدھے کو دیکھا۔ گدھے نے دانت نکال دیئے۔ وہ اس کی استہزائیہ مسکراہٹ دیکھ کر شرمندہ سا ہو گیا۔
"میں بھی اس کے بارے میں تو سوچ نہیں رہا تھا۔ بخدا میں اپنے عہد پر قائم ہوں۔ میں نے اتنا عرصہ کبھی اس کے بارے میں سوچا ہے؟ اچھا نہیں تو نہ مانو۔"

اس کی نگاہیں پھر سامنے کو اٹھ گئیں۔ بگولے دہلیز کو پار کر کے کال کوٹھریوں میں جاتے تھے اور اندھیروں سے گلے ملتے۔

ایک دن وہ آئے تھے اور اس نے سوچا تھا کہ اب میری گردن بگولوں اور اندھیروں کی گرفت سے آزاد ہو گی۔ نیچے پیچھے باسیوں نے دیکھا تھا۔ دونوں بابو انگریزی میں باتیں کرتے ہنستے ہوئے اس کے گھر سے نکلے تھے اور پیٹ میں سوکھے شلغموں کی گڑگڑ کو دبا کر اس کے گدھے پر سوار ہو گئے تھے۔

علاقے کے دورے سے لوٹ کر انہوں نے اپنی خالی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر منہ ٹیڑھا کر کے کہا تھا۔ "سوری، یہاں پیسہ اور وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

انہیں جاتا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آگ بھر گئی تھی۔ اس کا جسم

سننا اچھا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ ان بابوؤں کو سفید زمین گاڑ کر سہاگہ پھیر دے۔ لیکن انہیں وہ صرف دیکھتا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے کانوں میں دھک کی جگہ قہقہے ابھرنے لگے تھے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تھا لوگ چیخ چیخ کر ہنس رہے تھے۔

پاگل ای اوئے۔ پاگل ای اوئے۔

قہقہے بڑھتے بڑھتے پھیل گئے۔ کھڑکی کھٹاک سے بند ہوئی۔ دور بیابانوں سے بگولوں کا قافلہ آ رہا تھا۔ لوگوں کی ہنسی اور تیز اور تیز۔

پاگل ای اوے، پاگل ای ہوئے۔ انہوں نے بچے پچھے پوٹلیوں پہ سامان لادا تھا۔ ہنستے ہنستے سب نے گھر پر لات ماری تھی۔ اور قدم بڑھا دیئے تھے۔

انجیر کے تنے سے ٹیک لگا روہانسا کھڑا وہ خاموشی سے اپنے ہاتھ میں انجیر کے پتے کو سہلاتا رہا تھا۔ سب سے آخر میں وہ اپنے بابا کے سامنے نکلی تھی۔ اس نے ہوا کا گھونٹ بھرا تھا۔ دونوں باپ بیٹی نے کچھ عرصہ ایک دوسرے سے کھسر پھسر کی تھی اور اس کے پاس آئے تھے۔

"اپنی ہٹ دھرمی چھوڑ دو اور چلو"

لونگ والی اسے دیکھے جا رہی تھی۔

وہ چپ تھا

"میرے تمہارے باپ کے ساتھ بہت گہرے تعلقات تھے۔"

"میرے اپنی ماں کے ساتھ زیادہ گہرے تعلقات ہیں۔"

"یہ تھوڑا سا رقبہ تمہارا کب تک ساتھ دے گا۔"
اس نے کیاریوں کی طرف دیکھا تھا۔ جب تک میں ہوں۔
"چلو ہم دریا کے پار چلیں"
دریا کے پار بھول کا رستہ ہے۔ جو گئے۔ کھو گئے۔
"میں نے تمہارے باپ کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ اپنی بیٹی کی شادی تمہارے ساتھ کروں گا۔"
لڑکی نے پلکیں نہیں جھپکی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں اژدھے کی آنکھیں تھیں۔
اس کے ہاتھ میں انجیر کا پتا ری طرح مسلا گیا تھا۔
"چلو۔"
میرا دوسرا قدم خلا میں پڑے گا۔
"تو تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔"
"میں نہیں جاؤں گا۔"
اس نے اپنے آپ کو اژدھے کی آنکھوں سے چھڑا لیا تھا۔ لڑکی کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔
بڈھے نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "تم اس ویرانے میں زندہ نہیں رہ سکو گے۔ وہ دیکھتے ہو سامنے۔"
ٹنڈ منڈ درختوں پہ گدھ سر نیوڑھائے بیٹھے تھے۔
"میں نے اپنے لئے یہ فیصلہ خود کیا ہے۔ کیوں کہ مجھ میں زندہ رہنے

کی خواہش ہے۔ تم لوگوں میں سکت نہیں ـــــ اس لئے بھاگ رہے ہو
وہ دیکھتے ہو سامنے کیکر کے درخت کیسے ہرے بھرے ہیں جو ہر روز ایک
سوت بڑھتے ہیں۔"

بڈھے نے احمقوں کی طرح کیکروں کو دیکھا۔

"ان کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ اتھاہ سے رس پیتی ہیں۔
تم نے فرار کا راستہ خود چُنا ہے۔ تم اس جگہ کو ترک کر کے کہیں جگہ نہیں
پاؤ گے۔ بھٹکتے رہو گے کہ تمہاری یہی سزا ہے۔"

"بکواس بند کرو" بڈھا چیخا تھا۔ اور ٹنڈ منڈ درختوں پر گدھوں نے
سر اٹھا کے دیکھا تھا۔

"ہم تمہیں ترک کرتے ہیں کہ تمہارے نصیبوں میں یہی لکھا ہے۔

"جو بھی کہو ـــ پر میری اپنی خواہش ہے۔"

"تمہاری وابستگی کی یہی سزا ہے۔" اس نے اپنی لڑکی کا کندھا بھینچا ہوا
تھا۔ "یہ سیاہ بخت ہے"

لڑکی نے اپنی پھٹی لونگ پر سفید چادر کا پلو گرایا تھا اور چلی گئی تھی
اور رینگتی لکیر کی آخری کڑی بن گئی تھی۔ ٹنڈ منڈ درختوں پر سارے گدھوں نے
اپنے پر پھڑ پھڑائے تھے اور لکیر کے ساتھ روانہ ہو لئے تھے۔

"میں سیاہ بخت ہوں" ـــ رینگتی لکیر کو فاصلہ نگل گیا تھا۔ وہ مسکرایا تھا
اس نے کیکر کے پتوں کی ساری سبزی آنکھوں میں سمیٹی تھی اور زمین پر لوٹنے لگا
تھا۔ جب اس کے ایک ایک مسام میں سیلی سی دوڑ گئی تو اس نے عزم سے

ساتھ گدھے پر بالٹیاں لادی تھیں ۔ اور اس کی تھوتھنی کو چوما تھا ۔ ہم سیاہ بخت ہیں میری جان کہ ہم نے یہ راستہ خود چنا ہے ۔" اور اسے بڑی محبت سے ہانکتا دریا کو روانہ ہوا تھا۔

اس نے کھڑکی میں اندھیرے اور بگولوں سے آنکھیں چھڑا کر زمین کو دیکھا۔

ہوں پھر زبان خشک ہے۔

اس نے اٹھتے ہوئے گدھے کو ہانکا۔

آؤ پھر دریا کو چلیں کہ پانی بھاپ بن کے آسمان پہ چلا گیا ہے، آؤ کہ ہم اس دائمی عمل کا حصہ ہیں یہی ہمارا انعام ہے ۔ یہی ہماری سزا ہے کہ یہ ہمارا اپنا فیصلہ ہے کہ ہم زندہ رہیں گے ۔ ہماری کشمکش کا ثمر ہماری خواہشوں کا تسلسل ہے ۔

اس نے گدھے پہ بالٹیاں لادیں اور مضبوط قدم اٹھاتا ہوا دریا کو چل دیا۔

اختتامیہ

اردو افسانہ کے قارئین کے لئے 'چوراہے' کی کہانیاں غیر معمولی حد تک تجرباتی اور انوکھی ہیں۔ جب یہ کہانیاں مختلف جرائد میں شائع ہوئیں اور ادبی محافل میں پڑھی گئیں تو قارئین اور سامعین نے انہیں جدید شاعری کی بہن کہا اور چپ سادھ لی۔ اس میں قصور اس افسانہ نویس کا نہیں بلکہ افسانوی ادب کے گندم نما جو فروش نقادوں کا ہے۔ جنہوں نے مقبولیت کی کسوٹی بنا کر قارئین کے ساتھ دشمنی کا ثبوت دیا ہے۔ منٹو کی وفات کے بعد اردو افسانے کی سمت رومانوی، جذباتی اور اکتا دینے والی تکرار سے یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ آجکل کا افسانہ غزل بن گیا ہے۔ افسانہ نویسوں کے پاس محبت اور جنس کے قصوں کے علاوہ اور کچھ نہیں رہا۔ زندگی کے بطن میں جو تغیرات جنم لے رہے ہیں۔ بین الاقوامی انسان کی شبیہہ جو رنگ بدل رہی ہے۔ ان سے اردو کے افسانہ نویس اور نقاد دونوں بے خبر ہیں یا تشخیص کی صلاحیت نہیں رکھتے کیوں کہ علم سے مدفون کو چڑ ہے۔ اور آگہی ان کے لئے گالی ہے۔ ان کے نزدیک کہانی کچھ جذبات کا اظہار اور یاد رفتگاں کو قلمبند کرنے کا حسین بہانہ ہے۔

لیکن یہ حسین بہانوں کا دور نہیں بلکہ تمام افسانوں کے لئے مرحلہ فکر ہے کیونکہ انسان کا مقدر ایک نئے چوراہے پر ہے۔ جہاں وہ ظاہر و باطن کے الجھتے ہوئے گتھم گتھا راستوں اور مختلف نظام ہائے زندگی میں گھرا ہوا ہے۔ وہ اس چوراہے پر کس طرح آیا۔ اس کی شہادتیں 'چوراہے' کے مختلف

افسانے ہیں جو جدید انسان کے ذہنی اور جذباتی روئیداد سے مرتب ہوتے ہیں۔ چوراہے کے افسانوں کا انسان (EXISTENTIAL SITUATION) میں ہے جس نے زندگی کو تیاگنے کی بجائے قبول کیا ہے۔ یہ قبولیت ہی اس کی آگاہی اور اس کے کرب کا سامان مہیا کرتی ہے۔ اس کے تمام اعمال کی غایت وجود کی معنویت کی تلاش ہے۔ اس نے اس سفر میں مروجہ مابعد الطبیعاتی نظام کو قبول کرنے کی بجائے زمین اور اس میں اگنے والے نظاموں کو اپنا حوالہ بنانے کی کوشش کی ہے اسے اپنی جبلی آزادی کا احساس ہے لیکن وہ انا کا قیدی ہے۔ وہ کرنے اور نہ کرنے کے تضاد میں تلملا رہا ہے۔ اس کی بے بسی میں انسانی زندگی لایعنیت کا ایک کھیل نظر آتی ہے، کبھی وہ لایعنیت کو معنویت سمجھتا ہے۔ کبھی وہ عہدِ حاضر کا بدھ بن کر سوستکا کی تلاش میں نکلتا ہے لیکن رنجیدہ اور ناخوش واپس آتا ہے۔ کبھی سعد البحرائی بن کر پاگلوں کی وادی میں گھومتا ہے۔ اس کی جستجو کا منتہا کیا ہے؟ اس کا جواب پھر جستجو ہے کہ قاری خود ایک لفظ بن کر چوراہے کے جملوں کا جزو بن جائے اور بذاتِ خود مصنف کے ساتھ اس سفر کو طے کرے۔ وہ مختلف سطحوں پر مختلف جواب دینے کی کوشش کرے گا۔ چوراہے کے افسانوں کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ مصنف نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ عہدِ حاضر کے مختلف تضادات کو محسوس کیا ہے۔ اس نے اپنے معاصر نام نہاد فہم کے جدید افسانہ نویسوں کی ذہنی نرگسیت، لکھنو کے مٹتے کلچر کے ماتم اور جنسی گتھیوں کو موضوع نہیں بنایا بلکہ انسانی تماشے

میں انسان کو مرکز بنا کر اس کی بے چین اور گھبرائی ہوئی صورت کو بہت قریب سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

ان کہانیوں کا کوئی مخصوص جغرافیہ نہیں۔ ان کا تعلق ایک آفاقی سیاق و سباق سے ہے جس میں انسان اجتماعی صورت میں ہیں جس میں حاکم اور محکوم ہیں جس میں مشین اور پرزوں کی کھڑکھڑاہٹ، ہسپتالوں کے مریض، ٹک ٹک کے چلتے ہوئے دلوں کی دھڑکن، ذات کی گھٹن ہے۔ "چوراہے" کے مطالعے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسان کے عوامل ایک دوسرے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ مختلف نظاموں میں آزمائش کے چوراہے پر ہیں، کیوں کہ اس کے سامنے رستے گم ہو گئے ہیں۔ وہ شب درون سے نبرد آزما ہے۔ اس کے کرداروں کی دوڑ وقت کے ساتھ ہے، جو خواہشوں، نفرتیں، حقارتیں اور زنجیر کے علامتیں ہیں، جنہیں انسانی تاریخ یاد ہے جو سانپ، اژدہے، درخت، عیسیٰ، چنگیز، ہٹلر کے تجربات سے آگاہ ہیں۔

چوراہے کی موضوعات کی طرح ان کی تکنیک بڑی متنوع ہے۔ تکنیک سے مراد محض اسلوب بیان ہی نہیں بلکہ سوچ، ادراک اور اظہار کے تمام مراحل ہیں۔ مصنف کا طریق کار SURREALISTIC ہے۔ وہ انسانوں، اشیاء اور منظر کی منطقیت کو اپنے جذباتی تجربے کے زیر اثر نئے طریقے سے مرتب کرتا ہے اور اس کے ہی منظر کو ایک غیر منطقی کر دیتا ہے۔ وہ استعاروں میں سوچتا ہے اور استعاروں اور علامتوں کے ذریعے اظہار کرتا ہے جس کی وجہ سے ان کہانیوں میں تجرید کا عنصر کافی نمایاں ہے۔ اس لئے عام

قاری کے لئے بعض اوقات ابہام میں دقت پیش آتی ہے۔ "چوراہے" کے افسانوں میں مصنف نے "شعور کی رو" کو بنیادی تکنیک کے طور پر استعمال کیا ہے اور پھر اس سے مختلف قسم کی (VARIATIONS) پیدا کی ہیں۔ بیان کے دوران میں وہ حقیقت اور فینتسی کے امتزاج سے معانی اور رنگ کی مختلف سطحیں پیش کرتا ہے اور یہاں وہ کسی حد تک کافکائی تکنیک سے متاثر ہے۔ لیکن اس میں بھی مصنف نے انفرادیت کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً "سب سے پرانی کہانی" میں افسانے کا ڈھانچہ کافی حد تک حقیقی ہے۔ لیکن اس کے آخری جملے سے سارے افسانے کی ماہیت بدل جاتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ایک فینتسی ہے۔ ایک شخص جو وادی میں سیر کرنے آیا ہوتا ہے، گدھ اور لاش کو دیکھ کر اس کے ذہن کا تلازمہ مختلف جہتوں میں سفر کرنے لگتا ہے۔

"چوراہے" کی ایک خصوصیت اس کی جذباتی شدت اور اس سے پیدا اشارہ امیجز کا استعمال ہے۔ اس کے امیجز انوکھے اور حیرت انگیز حد تک نئے ہیں، کبھی تو وہ چھوٹے چھوٹے امیجز سے ایک بڑا امیج تیار کرتا ہے۔ اور کبھی ایک بڑے امیج سے چھوٹے چھوٹے امیجز بناتا ہے۔ اس کی واضح مثالیں مرگی اور یکہ ہیں۔ اکثر جگہوں پر اس نے مرکب تکنیک کو بھی استعمال کیا ہے، یعنی وہ چلتے چلتے مختلف دیومالاؤں کے واقعات کو زیر بیان واقعہ سے متعلق کرتا ہے، حقیقت اور فینتسی کو باری باری استعمال کرتا ہے اور ان تمام کو (SURREALISTIC) طریقے سے ایک جگہ

مرتب کرتا ہے ـــــ پچورا ہے ہیں اگر مصنف کی جذباتی شدت جا بجا نظر آتی ہے تو اس نے فکری عنصر سے اس شدت کو متوازن بنایا ہے۔ وہ چلتے چلتے ایسے جملے اور لفظ استعمال کر جاتا ہے جن کی معنویت دوگونہ ہوتی ہے جو عام بیان کی ضرورت کو پورا کرتے ہوئے مابعد الطبیعیاتی علامتوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً سب سے پرانی کہانی، ہیں وہ ایک جگہ پر لکھتا ہے ـــــ "یہ کون ہے ؟ ـــــ کہاں سے آیا ہے ؟ ـــــ وہ پہلے سے یہاں موجود ہے یا اب آیا ہے" ـــــ اس قسم کی بیشتر مثالیں پچورا ہے ہیں موجود ہیں۔ مصنف کا پیرایۂ بیان اس حد تک مثالیہ ہے کہ پچورا ہے کی بیشتر کہانیاں شاعری کی حدود میں داخل ہو گئی ہیں۔

انیس ناگی

۲۹ لاہور
دسمبر ۱۹۶۴ء

دردکاشہر (زیرِ طبع)

زاہد ڈار کو انسانوں سے بڑی محبت ہے۔ وُہ انسانیت کا پرچارک ہے۔ نظمیں پڑھ کر آپ کو محسوس ہوگا، جیسے آپ کسی ایسے انسان سے مل کر آرہے ہیں، جو تمام لوگوں کے دکھ اکیلا سہہ رہا ہے۔

چار چپ چیزاں:۔ (پنجابی نظموں کا مجموعہ) منیر نیازی اپنے طرز فکر اور طرز اسلوب میں نمایاں ہے۔ آج کی شاعری میں نئے رنگ اس کے رہین منت ہیں۔ قیمت ۲ روپے

دیواریں:۔ (افسانے۔ زیرِ طبع) جواں فکر ادیب "ضمیر ملک" نے معاشرے کی کہنہ دیواروں کے خلاف جہاد کیا ہے۔ اس کی جگہ اس نے اپنے خون اور ہڈیوں سے نئی دیواریں تعمیر کی ہیں۔ اس کی تحریریں جذبات اور چارہ ساتھ ساتھ ہیں۔

نئی مطبوعات ۔ ۲۔ ۱ ۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔

مطبوعہ:۔ انار کلی پرنٹنگ پریس لاہور

مبارک احمد

"زمانہ عدالت"

اور

دوسری نظمیں

(زیرِ طبع)

نئی مطبوعات، لاہور

سلمان آرٹ پریس، لاہور